ڈوبتی ہوئی پہچان
افسانے
حسانہ انیس

ڈوبتی ہوئی پہچان

حسّانہ انیس

افسانے

Doobti Hui Pehchaan

(A collection of short stories)

By: Hassana Anis

انیس الحق، فلیٹ نمبر 4، اتحاد آرکیڈ، بلاک 7، گلستانِ جوہر، کراچی۔ 73290

فون نمبر: 8125182

46251 82

□ اہتمام
محمود واجد

□ اشاعت
دسمبر 2003ء

□ کتاب
ڈوبتی ہوئی پہچان (افسانے)

□ مصنف
حسّانہ انیس

□ سرِ ورق
حنا

□ کمپوزنگ
عامر شہزاد

□ تعداد
پانچ سو

□ قیمت
150 روپے (15 ڈالر، 10 پاؤنڈ)

□ مطبع
احمد برادرز پرنٹرز۔ناظم آباد، کراچی

ZAIN PUBLICATIONS
A-8, Nadeem Corner, Block-N,
North Nazimabad, Karachi-74700.
Phone: 6645177, 6679796.

انتساب

اپنے وقت کے مقبول افسانہ نگار

والد محترم پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

کے نام

جن کی شفقتوں اور حوصلہ افزائیوں نے مجھے نہ صرف اُن کا پیشہ اختیار کرنے بلکہ اپنے تجربات و مشاہدات کو افسانے کی صورت میں بیان کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

نام : حسّانہ انیس

والد کا نام : پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

پیدائش : ہزاری باغ، جھاڑکھنڈ۔ (بھارت)

12/ جولائی 1939ء

تعلیم : ادیب کامل (علی گڑھ یونیورسٹی)

ایم اے، اردو (ڈھاکا یونیورسٹی)

پیشہ : درس و تدریس (محکمۂ تعلیم حکومت سندھ)

گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین، کراچی

گورنمنٹ کالج آف ہوم اکنامکس، کراچی

پرنسپل گورنمنٹ گرلز کالج اورنگی ٹاؤن، کراچی

ریٹائرمنٹ : 11/ جولائی 1999ء بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر

آخری ملازمت بعد از ریٹائرمنٹ: پرنسپل Axis گرلز کالج، بہادر آباد، کراچی

ایوارڈز : بیسٹ ٹیچر آف دی ایئر۔ 1980ء

اعلیٰ تدریسی، ادبی اور انتظامی خدمات کے صلے میں سندھ پروفیسرز اینڈ لکچررز ایسوسی ایشن کی جانب سے 1997ء میں اور کالج پرنسپلز ایسوسی ایشن کی جانب سے 1999ء میں شیلڈز عطا کی گئیں۔

انتقال : 7/ جولائی 2003ء (کراچی)

فہرست

(الف) ابتدائیہ

(ب) افسانے

حسّانہ اور اُن کے افسانے

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

گذشتہ سال ایک طویل وقفے کے بعد حسّانہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ عبداللہ کالج لیاری جا پہنچیں جہاں کسی تقریب کے سلسلے میں شریک تھا۔ انہیں میرا نیا ٹھکانا معلوم نہیں تھا، اس لیے ملاقات کی یہ صورت نکالی۔ تقریب کے بعد ہم دونوں باتیں کرنے لگے اور میں نے اُن سے کہا کہ وہ میرے ساتھ گھر چلیں۔ بلقیس بہت دنوں سے انہیں یاد کر رہی ہیں۔

ہم دونوں چل پڑے۔ راستے میں انہوں نے بتایا ''مجھے کینسر ہو گیا ہے، مگر زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو کوئی حسرت نہیں ہے۔ بچوں کو اپنی منزل مل گئی ہے، ہاں ایک بچہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ تو کیا ہوا۔ انشاءاللہ زندگی کی موجِ رواں اُسے منزل پر پہنچا دے گی۔'' یہ سب کچھ انہوں نے اس طرح کہا کہ جیسے وہ نزلے، زُکام کی بات کر رہی ہوں۔ زندگی سے تعلق اور بے تعلقی کا ایسا امتزاجی بیان اور اظہار میرے لیے نئی اور انوکھی بات تھی۔ اور اُس دن سے آج تک میں سوچتا ہوں کہ اُس ہری بھری خاتون کا ایمان کیسا شاداب، زندگی کی تفہیم کیسی گہری، دکھ جھیلنے کا انداز کیسا عظیم تھا۔ وہ عورت تو ایسی تھی کہ اپنی بیماری کو بھی ایک عظیم انسان اور فن کار کی طرح تماشا جانتی تھی۔ وہ اپنا، اپنی آہستہ آہستہ قریب تر ہونے والی موت کا تماشا جیسے دیدۂ غیر سے کر رہی تھی۔

حسّانہ گھر پہنچیں تو بیوی سے باتیں شروع ہوگئیں۔ یہ دو ماؤں کی ملاقات تھی اسی لیے مرکزی موضوع کا درجہ بچوں کو حاصل تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ حسّانہ کو ہماری چاروں بچیوں کے نام یاد تھے۔ کہنے لگیں ''وہ سب سے چھوٹی بچی کہاں ہے جو مجھے دیکھ کر صوفے کے پیچھے چھپ جاتی تھی اور نظر نہیں آتی تھی۔'' پھر کیمپس کا ذکر چھڑ گیا۔ حسّانہ کہنے لگیں ''مجھے دکھ ہے کہ کراچی یونیورسٹی کا ٹاؤن شپ اپنے آپ کو کھو رہا ہے۔ شہر اس تک پہنچ گیا ہے۔ میں نے پہلے پہل گرمیوں میں کوئل کی آواز وہیں سنی تھی۔'' اور مجھے وہ دن یاد آ گیا جب حسّانہ پہلے پہل ہمارے گھر برادرم محمود واجد ہاشمی کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ پی ایچ ڈی کرنا چاہتی تھیں اور اردو افسانے کے کسی مسئلے پر۔ ہم گفتگو کر رہے تھے۔ مختلف موضوعات سامنے آئے۔ آخر ہم نے ایک موضوع پر اتفاق کیا۔ ''اردو افسانے میں دیہات اور شہری کشمکش''۔ حسّانہ خاصی پابندی سے آنے لگیں۔ میں نے انہیں ڈاکٹر صبیحہ حفیظ کے سپرد کیا کہ وہ اُن سے عمرانیات پڑھیں اور اس موضوع کے عمرانیاتی پہلوؤں کا مطالعہ کریں۔ حسّانہ پڑھتی رہیں، سوچتی رہیں لیکن وہ کاملیت پسند تھیں اور پھر اُن کی تدریسی اور گھریلو مصروفیات۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام پورا نہ ہو سکا اور وہ زندگی کی کشمکش سے آزاد ہوگئیں۔

میں نے جو باتیں حسّانہ کی ذات اور شخصیت کے بارے میں عرض کی ہیں، اُن کا گہرا تعلق اُن کے فن سے ہے۔ انہوں نے زیادہ تر انسانوں کی طرح زندگی بسر نہیں کی بلکہ اپنی زندگی کو اپنے حوصلوں اور شعور کے مطابق ایک صورت اور ترتیب عطا کی۔ فن زندگی کی رپورٹنگ یا عکاسی (فوٹو گرافی) نہیں ہے بلکہ فن کار زندگی کو اپنی اقدار کے مطابق ایک آہنگ عطا کرتا ہے۔ احسن الخالقین نے اپنے بندوں میں سے جنہیں صلاحیتِ تخلیق دی ہے یہ اُن کی پہچان ہے۔ پھر تعلق کے ساتھ لاتعلقی فن کے لیے لازم ہے، اسی لیے فن میں موضوعیت بھی ہوتی ہے اور معروضیت بھی۔ حسّانہ کا حافظہ جزئیات گیر تھا اور وہ جزئیات کو پیش کرتے ہوئے عملِ انتخاب سے کام لیتیں۔ ان ہی دو خصوصیات کے ذریعے انہوں نے ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان رشتہ قائم کیا اور یہی وحدت ہمیں اُن کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ اِس

خصوصیت کے بغیر طویل مدت پر محیط کہانیاں، واقعات کی کھتونی (مجموعۂ بے ترتیب) بن جاتی ہیں، فن پارہ نہیں بن پاتیں۔ اچھے فن پارے میں واقعات کا رشتہ انسانی زندگی، کرداروں اور اُن کے تعامل (Interaction) سے قائم کرنا پڑتا ہے۔ حسّانہ کے ہاں اس کی بہترین مثال اُن کا آخری اور اِس مجموعے کا پانچواں افسانہ ''ڈوبتی ہوئی پہچان'' ہے۔ مینا اور لوسی کا رشتہ اِس کائنات کی وحدت کا ایک اشارہ ہے۔ یہ محبت کی ہمہ گیری کا استعارہ بھی ہے۔ محبت جو حیوانی جبلّت کو بھی شعور کی سطح عطا کر دیتی ہے۔ یہی محبت جب مینا مسز یاور بن جاتی ہے تو لوسی کے وسیلے سے پوسی کے وجود میں منتقل ہو جاتی ہے۔ زندگی بدلتی اور بڑھتی رہی۔ Lap Top نسل آ گئی مگر مسز یاور اپنی دنیائے محبت میں زندگی گزارتی رہیں اور آخر وہ اپنی ہم زاد پوسی کو کھو بیٹھیں۔ مرتی ہوئی پوسی سے انہوں نے کہا ''تم خوش قسمت ہو کہ دکھوں سے نجات پا گئیں۔ میرے لیے ایسی کوئی دوا نہیں۔'' بات یہ ہے کہ مرض اور تکلیف ہی انسان کی دوا ہے۔ حسّانہ نے اِس کہانی میں نسلوں کا رشتہ، زندگی کے دکھ، انسانوں کے بدلتے ہوئے روابط کا سارا بوجھ اُن لفظوں پر ڈال دیا جن سے یہ کہانی بُنی گئی ہے۔ یہ حسّانہ کی اپنی کہانی ہے جسے فن نے نیا قالب عطا کیا ہے۔ اس میں بہت گہری ''شعریت'' بھی ہے۔ شعریت اُس لفاظی اور لفظوں کی نمائش و آرائش کا نام نہیں جو نیاز فتح پوری اور اُن کے قبیل کے افسانہ نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔ شعریت اُس گہرے احساس سے عبارت ہے جو زندگی کو سمجھنے کی کوشش میں موت سے الجھتا ہے، جو پرتیں ہٹا کر مفہومِ حیات تک پہنچنے کی سعی ہے۔ اور یہ شعریت آج کے افسانے کی پہچان ہے خواہ افسانے کی تکنیک کوئی بھی اور کچھ بھی ہو۔

حسّانہ کے ہاں شعر اور کہانی کی سرحدیں اکثر مل جاتی ہیں۔

''ایک وہ تھی کہ گم ہو کر بھی خوشبو کی طرح اُس کے وجود میں بس رہی تھی۔''

(طوفان میں ٹھہرا ہوا لمحہ)

آج کے افسانے میں ''نتیجہ'' نہیں ہوتا بلکہ زندگی بھر بالواسطہ تبصرہ ہوتا ہے۔ ''نائٹ میئر'' میں حروف کی زبانی پوری زندگی پر تبصرہ ہے۔ افسانے میں زندگی کا ہر عمل حروف

نئی صورت میں اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ وقت کا پھیلاؤ اور سمٹاؤ حسّانہ کی اپنی تخلیق ہے۔ کہانی کا اختتام ''مرحومہ نے تمام عمر دنیا کمائی، اللہ مغفرت کرے''، ٹریجڈی کا مفہوم ہمارے ذہن پر آشکار کرتا ہے۔

حسّانہ الفاظ کی قدرت و قیمت جانتی ہیں۔ وہ لفاظی سے بچتی ہیں کیونکہ وہ لفظ کی طاقت سے آشنا ہیں۔ عام الفاظ اُن کے ہاں افسانے کی فضا کی تعمیر کرتے ہیں۔

''لیکن محسن تھا جس نے اُس کے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے وجود کو محبت سے اٹھایا، دھویا اور پیار کے نرم تولیے میں اُسے لپیٹ کر عزت و وقار کا لباس پہنایا۔'' (سنگ سار)

''محسن جس نے گلی میں رُلنے والے پتھر کے ایک حقیر ٹکڑے کو اٹھا کر مسجد کے مینار میں نصب کر دیا تھا۔'' (سنگ سار)

حسّانہ کا وجود ہمارے معاشرے کے لیے ایک خوشبو تھا اور

''خوشبو بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ خالص ہو تو اپنا نقصان کیے بغیر ماحول کو دلکش اور دل آویز بنا دیتی ہے۔''

ہمیں اس سہ البادی دنیا میں رہتے ہوئے یہ فکر ستاتی ہے کہ کیا کسی اور دنیا میں زندگی کی اور ابعاد (Dimension) بھی ہیں۔ شاید یہ حسّانہ کا بھی مسئلہ ہو اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے وہ اس سہ ابعادی دنیا کے حدود سے باہر نکل گئی، نئی ابعاد کی تلاش میں۔

(۲۵ ویں شب قدر، رمضان المبارک ۱۴۲۴ھ۔ ۲۱ر نومبر ۲۰۰۳ء)

☆☆☆

حاصلِ ایں سوز و ساز

ڈاکٹر حنیف فوق

اقبالؔ جیسے بڑے رجائیت پسند کو ''حاصلِ ایں سوز و ساز، یک دلِ خونیں نواست'' نظر آیا تھا۔ پھر جس کی فطرت ہی مائلِ غم ہو، وہ غم کی افسانہ تراشی کیسے نہ کرے۔ حسّانہ انیس ایک ایسی ہی افسانہ نگار ہیں، جن کے افسانوں کی فضا، کردار، بیان، رفتار، آہنگ اور موضوع سے ایک ایسی ترتیب قائم ہوتی ہے، جو زندگی کے دکھوں کا پتہ دیتی ہے۔ ان کے بیان میں بعض جگہ مثلاً مناظرِ فطرت کے سلسلے میں زندگی کے حسن و جاذبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر ان کی حسّاس طبیعت ان کے افسانے کے انجام کو اس معنویت کی طرف لے جاتی ہے جس سے خونیں نوائی ٹپکتی ہے۔ یہ نہیں کہ ان کی حساسیت نے کہیں غیر ضروری جذباتیت کی شکل اختیار کر لی ہو۔ لیکن ان کے افسانے ایسے زاویاتِ نظر پر مبنی ہیں جن میں زندگی کی ہچکاری نظر آتی ہے۔ اردو میں افسانہ نگاری کے فن نے بہت ترقی کی ہے اور اب تک لاتعداد افسانے لکھے گئے ہیں۔ لیکن ایسے افسانوں کی تعداد بہت کم ہے، جن میں ایک مجموعی زاویۂ نظر کی کارفرمائی ملتی ہو۔ ان کے زاویۂ نظر سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن کم ہی افسانہ نگار ایسے ہیں جن کے افسانوں میں معاملاتِ زندگی کے بیان میں ایک ایسی سمت ملتی ہے جو زندگی پر ان کے مجموعی زاویۂ نظر کا پتہ دیتی ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو تھوڑے بہت تغیر و تبدل کے

ساتھ پیش کرنے کا کام تو افسانہ نگار کرتے ہی آئے ہیں اور انہیں پیش کرنے والے ایسے ماہرینِ فن بھی ہوئے ہیں کہ ان کے پیش کردہ افسانے حقیقت کی حقیقت سے زیادہ تصویر بن گئے ہیں۔ لیکن ایک مجموعی زاویۂ نظر کی بات کم افسانہ نگاروں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے اور حسّانہ انیس کے افسانوں میں یہ زاویۂ نظر ایسا نمایاں ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ زاویۂ نظر خود زندگی کا ایک تصوراتی خاکہ پیش کرتا ہے جس میں ان کی نسائی شخصیت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ ان جھلکیوں میں نسائی بغاوت کا روپ آج کی تحریک نسائیت کے مانند نہ سہی، لیکن حسّانہ انیس کی نسائی شخصیت میں غم سہنے اور ایثار کرنے کی نسائی صلاحیتوں کی جلوہ گری ضرور نظر آتی ہے۔ لیکن ان سب کا منظرنامہ اجتماعی احوال سے زیادہ ان کے اپنے شخصی رابطے ہیں یا ان کا گھر یا خاندان ہے۔ ان کے حوالے ہی سے ان کے افسانوں کا اجتماعی منظر بھی نمایاں ہوتا ہے۔

حسّانہ انیس کو سابق مشرقی پاکستان کے ماحول میں دیکھا اور ڈھاکا یونیورسٹی میں پڑھایا۔ پھر ہجرت کے بعد کراچی میں ان سے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی حسّاس طبیعت، نفاستِ مزاج، وسیع مشاہدے، ایثار پیشگی اود باریک بینی کے وہ عناصر جو ان کے افسانوں کے مجموعے ''ڈوبتی ہوئی پہچان'' میں ملتے ہیں، ان کی شخصیت کا ایسا حصہ تھے کہ ان کے بغیر حسّانہ انیس کا تصور محال ہے۔ ان کے افسانے گویا ایک بار پھر حسّانہ انیس کو مجسم کردیتے ہیں۔ اگرچہ وہ جلد ہی ہم سے رخصت ہوگئیں، لیکن یہ افسانے اردو ادب میں اپنے خاص زاویۂ نظر سے ایسا نشان قائم کرتے ہیں کہ انہیں اس وسیلے سے یاد رکھا جائے گا۔ ان افسانوں میں نہ صرف ان کے گردوپیش کی زندگی کے تاثرات ملتے ہیں بلکہ ان کے فنی تخیل نے ایسے نقوش بنائے ہیں جن پر ان کی شخصیت اور ان کے اندازِ نظر کی گہری چھاپ موجود ہے اور ان کی وجہ سے وہ ہمارے درمیان موجود رہیں گی۔

اس مجموعے میں کل گیارہ افسانے ہیں مگر ہر افسانے سے حسّانہ انیس کی زندگی اور فن کے ساتھ ساتھ ان کے اندازِ نظر کی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔ ''نائٹ میئر'' ایک کابوس کی کہانی

ہے۔لیکن یہ کابوس کردار کی داخلی کیفیات اور زندگی کی بدلتی ہوئی صورتوں کی وجہ سے ایک ایسا افسانہ بن جاتا ہے جس میں کردار کے حالات میں تبدیلی کے باوجود صورت حال کی سنگینی باقی رہتی ہے اور کہانی معمولی واقعاتی سطح سے ابھر کر ایک غیر معمولی نقش قائم کرتی ہے۔ بُری لکھائی کے بدہئیت حروف جو افسانے کے مرکزی کردار کو بچپن کے کابوس میں گھیر لیتے ہیں، بڑے ہو کر بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ساری عمر کوشاں رہنے کے بعد بھی، ان ہی بچوں کے کہے یا اَن کہے حروفِ شکایات کی صورت میں اسے اپنی گرفت میں ایسا جکڑتے ہیں کہ اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل ہونے لگتا ہے۔ زندگی کی بے سود کاوشوں کا یہ افسانہ حساس تخیل کی جھلک ضرور دکھاتا ہے لیکن حقیقت کے تاثر سے خالی نہیں ہے۔

اس مجموعے کا دوسرا افسانہ ''سنگ سار'' ایک ایسے جرم کی حقیقی یا خیالی تعبیر کا افسانہ ہے جس کی سزا روایاتِ پیشیں کے مطابق سنگساری ہے۔لیکن یہ صورت حال صرف تبدیلیٔ احوال کے جبر کے باعث پیش آتی ہے۔اسے نفسیاتی تجزیے کا افسانہ کہا جا سکتا ہے اور اس کا انجام ایک ایسی المناک کیفیت ہے جو موت کو گلے لگا لیتی ہے۔ احساسات کی شدت ایک معلوم دنیا کے نقوش پیش کرتی ہے لیکن اس معلوم دنیا میں روایتوں اور سماجی بندشوں کے تصورات ایک ایسے ماحول کی نشان دہی کرتے ہیں جہاں سارا بارِ غم نسوانی وجود کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور دو مرد دو طلاق ناموں سے نسائی کردار کو آزادی دے کر خود آزاد ہو جاتے ہیں۔ مرد عورت کے رشتے کے اس معاشری تصور سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جب تک اس کا وجود ہے، صورتِ حال کی المناکی بھی باقی رہے گی۔

حَنّانہ انیس کے افسانوں کے اس مجموعے میں خیال اور حقیقت کی کشمکش ''جب آنکھ کھلی گُل کی'' میں پوری المناکی سے ظاہر ہوئی ہے۔ اپنے چچا کو ذہنی ہسپتال میں داخل کرا کے واپس ہونے والے کردار کی ہم سفر ایک خوب بنی سنوری اور مسرت سے سرشار خاتون ہوتی ہے۔ مکالموں کی مدد سے آگے بڑھنے والے بیانیے کے آخر میں واضح ہوتا ہے کہ مسرت سے پُر خاتون خود ایسے حادثے سے گزری ہے جو اسے ذہنی ہسپتال تک لے گیا اور اب

دوسرے حادثے کی، جس سے وہ اب تک بے خبر ہے، تاب اس کے حواس نہیں لا سکتے۔ اس لیے اسے اس سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ ان افسانوں میں سے ہے جو تعجب خیز انجام رکھتا ہے۔ اپنے بیان کی دلچسپی اور اختتامی افسانوی موڑ سے یہ اچھا تراشا ہوا افسانہ بن جاتا ہے جس کا آخری جملہ زندگی کے حُزن کو ظاہر کرتا ہے ''لیکن مغرب سے آنے والی سڑک کے اختتام پر کچھ نہ تھا۔''

غالب نے کہا تھا:

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

لیکن اس ورقِ ناخواندہ پر ماضی کے گزرے ہوئے لمحوں کے نقوش ضرور مرتسم ہو جاتے ہیں۔

حسنٰنہ انیس کا افسانہ ''رات سے پہلے'' غالب کے دونوں مصرعوں کی افسانوی تفسیر ہے، جس میں افراد کی زندگی کے ساتھ معاشرتی ماحول کے اثرات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ شوہر سے برسوں کی جدائی کے بعد شمسہ زیدی، جس نے ازدواجی زندگی کی تلخی سہی، بالآخر ڈاکٹر وقار کے اصرار پر ہاں کہہ دیتی ہے۔ وہ اپنی ہمت اور اپنی ماں کی شفقت کے زیر سایہ آگے بڑھتی رہی اور اب ایک عالمی سائنس کانفرنس میں اپنے ملک کی نمائندگی کے لیے بیرونِ ملک جا رہی تھی۔ مگر اس کا ملک وہ نہیں تھا، جہاں اس کا بچپن گزرا اور جہاں اس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر الگ ہو جانے والی سرزمین کا باسی تھا۔ وہ وہیں اس الگ ہونے والی سرزمین میں رہ گیا تھا اور وہ دوسری سرزمین میں آ گئی تھی۔ لیکن پہلی سرزمین کی خوشبو اب تک اس کے مشامِ جاں میں باقی تھی۔ اس کا شوہر اپنے دیے ہوئے ٹیلی گرام کے مطابق اس کے پاس آتا ہے تو یہ صرف اس کی پہلے کے مقابلے میں بدلی ہوئی شخصیت ہی نہیں، کرشنا چورا، رجنی گوندھو کی متوالی خوشبوئیں اور کٹھل، آم، کیلے، اناس کے باغوں کی کشش بھی ہے جو اس کے وجود کو گھیر لیتی ہے اور وہ اپنا سر اس کے شانوں پر رکھ دیتی ہے۔ یہ بڑا خوبصورت اور

نازک افسانہ ہے جس میں الگ ہو جانے والے دیار کی کشمکش کا احساس ہوتا ہے۔ اسے بڑی ہنرمندانہ خوش سلیقگی سے پیش کیا گیا ہے جس میں مردانہ تعصب کی حقیقت کے باوجود تحریک نسائیت کی نعرہ زنی نہیں بلکہ ایسا فطری بہاؤ ہے جو خود افسانے کو دلکش بنا دیتا ہے۔ البتہ اس کا عنوان ''رات سے پہلے'' محلِ نظر ہے۔ کیونکہ انجام یہ ہے کہ ''اس کا کمرہ جیسے چھت سے فرش تک روشنی سے بھر گیا تھا۔''

اس دوسری ہجرت سے پہلے، پہلی ہجرت کا افسانہ بھی حسؔانہ انیس نے ''گلدان'' میں قلم بند کیا ہے۔ جس میں ماحول اور موسم ایک دوسرے میں ضم ہوتے چلے جاتے ہیں اور انجام میں فرش کی سرخی کرشنا چورا کی سرخی کی یاد دلاتی ہے۔ یہ گویا حقیقت کا دوسرا رخ ہے۔ شیشے کا وہ گلدان بھی ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے جس میں سرخ، زرد، اودے، نیلے اور سفید پھول بہت محبت سے سجائے گئے تھے۔ اسی افسانے میں شاعرانہ تاثر کی آمیزش اور حقیقتاً پرانے ریل کے ڈبوں میں گھر بنانے والے ہجرت نصیب لوگوں کے احساسات سے وسعت آئی ہے۔ حقیقت اور تاثر کا امتزاج اس افسانے کی خصوصیت ہے۔

''طوفان میں ٹھہرا ہوا لمحہ'' ایک لمحے کی کہانی ہے لیکن اس کے پیچھے جذبوں اور رواجوں کے کتنے ہی طوفان گزر چکے ہیں۔ بس وہ لمحہ باقی رہ جاتا ہے جو خود طوفان کی زد میں ہے اور جسے مناظر کے بیان سے افسانہ نگار نے سجانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس میں رومانی تاثر سے زیادہ خارجی مظاہر اہم بن جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ''منزل ہے کہاں تیری'' ایک مختلف نوعیت کی کہانی ہے جس میں تناور درخت ایک مجازیہ ہے جسے اس پار کے گاؤں سے رات کی تاریکی میں آئے ہوئے کچھ لوگ منحوس قرار دیتے ہیں اور جسے اس کے سائے میں پناہ لینے والے مقدس جانتے ہیں۔ وہ جو سمجھتے ہیں کہ تناور درخت کی جڑیں زمین کی شادابیوں کو چوس رہی ہیں اسے کاٹنے کے درپے ہیں اور جو اسے مقدس جانتے ہیں اسے بچانے کے لیے کٹ مر رہے ہیں۔ کیلے، ناریل کے درختوں اور ہوا سے ہلتے ہوئے درختوں کے درمیان بانس کی چٹائیوں اور قمچوں سے بنائی ہوئی دیواروں اور کھڑکیوں سے افسانہ نگار نے اس تمثیلی

کہانی کی مقامیت کو واضح کرنا چاہا ہے۔ لیکن مرد و عورت کی ایسی منزل کی تلاش کہ جہاں لوگوں کے دل سیاہ نہ ہوں، بے سود رہتی ہے اور منزل خود فریب منزل بن جاتی ہے۔

''ڈوبتی ہوئی پہچان'' جس کو اس افسانوی مجموعے کا عنوان بنایا گیا ہے، مینا یا مسز یاور کے علاوہ ان کی بلی پوسی کی کہانی بھی ہے۔ رفیق حسین نے اردو میں جانوروں کے بارے میں کئی یادگار کہانیاں لکھی ہیں لیکن رفیق حسین کے تمام حیوانی کردار اپنی سب جزئیات یہاں تک کہ ماحول و جوار کے بیان تک میں نمونۂ حقیقت نہیں۔ اس کے برخلاف حسّانہ انیس کی پوسی خود مینا کی ثانوی شخصیت (Alter Ego) کے طور پر ابھرتی ہے۔ حسّانہ انیس کے افسانوں میں کئی جگہ شہریانے کے عمل کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن ''ڈوبتی ہوئی پہچان'' میں صرف فلیٹوں کا جنگل ہی نہیں ملتا، وکٹورین طرز کے واحد مکان میں رہنے والی مینا، شہری زندگی کی ان تمام آزمائشوں سے گزرتی ہے جو انسان سے اس کی انفرادی شناخت چھین لیتی ہیں۔ اس کے بچے بہتر مستقبل کی تلاش میں ترقی یافتہ ملکوں کا رُخ کرتے ہیں اور ماں سے ان کا بس رسمی تعلق باقی رہ جاتا ہے۔ مینا کے شوہر یاور کی موجودگی میں بھی تنہائی کا احساس، جو کسی بڑے شہر کی زندگی کی سب سے زیادہ خصوصیت ہے، بڑھتا جاتا ہے اور اس کی موت کے بعد تو وہ جیسے بدرنگ کاغذ کا چیتھڑا بن جاتی ہے اور زخموں کی ٹیسوں سے چور پوسی کو ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق زہر کا انجکشن دیے جانے پر اس کا احساس یہی ہے کہ ''تم خوش قسمت ہو کہ دکھوں سے نجات پا گئیں، میرے لیے ایسی کوئی دوا نہیں۔ زندگی کا زہر پیتے رہنا اور جانے کب تک جیتے رہنا ہے۔'' حُزن تو اس زندگی کی عطا ہے لیکن اس حزن کو گوارا بلکہ خوش گوار بنانے والے مناظر بھی زندگی کی جدوجہد میں موجود ہیں۔ لیکن شاید اس کے لیے زندگی کے تناظر کی وہ تبدیلی ضروری ہے جو حسّانہ انیس کے افسانوں کے مزاج سے الگ ہے۔ البتہ زندگی کے حُزن کو حسّانہ انیس نے پوری شدت سے محسوس کیا اور اسے اپنے افسانوں کی بُنت میں اتار دیا ہے۔

''بے بال و پَر'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں حسّانہ انیس کے فن کی یہ خصوصیت نمایاں ہوگئی ہے۔ بڑھاپے اور بیماری کا شکار ایک تنہا فرد، جس کے بیٹے لندن اور نیویارک

میں جابسے ہیں اور جن کے خطوط سے اسے اپنی بہوؤں کی چوڑیوں کی کھنک اور پوتوں کے معصوم قہقہے سنائی دیتے ہیں، خود بے بال و پَر کی زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن چڑیا چڑے کی آشیاں سازی اسے پھر زندگی سے تعلق کی جانب لے آتی ہے۔ لیکن چڑیا ظالم بلّی (زندگی) کا نشانہ بن جاتی ہے اور چڑا زخمی ہوجاتا ہے۔ تیمارداری کے باوجود چڑا پرواز کی طاقت کھو چکا ہے اور اس کے بچے بے نیازی سے اپنی پرواز میں مگن ہیں۔ یہ دیکھ کر بیمار بوڑھا بھی لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ بظاہر یہ چڑیا چڑے کی کہانی ہے لیکن درخت کی شاخوں میں اٹکے ہوئے خزاں رسیدہ پتے اور چڑیا اور اپنے بچوں کے تقابل سے حسّانہ انیس نے افسانے کو زندگی کے رنگ دے دیے ہیں۔

حسّانہ انیس کے افسانے ''واپسی'' میں خیال اور حقیقت کا فرق جیسے مٹ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے نسوانی کردار کی کہانی ہے جس کے والدین سابق مشرقی پاکستان میں مارے گئے ہیں، لیکن جس کے خیالوں میں وہ خطۂ ملک (جواب الگ ہوگیا ہے) جاگزیں ہے۔ جس کی زمین اسے سوتے جاگتے بلاتی ہے اور شعور کی گرفت کمزور پڑتے ہی وہ پھر اسی دنیا میں پہنچ جاتی ہے جہاں اس کا بچپن گزرا ہے۔ ہجرت (یا دوسری ہجرت) پر تو اردو میں کئی اچھی کہانیاں لکھی گئی ہیں مگر واپسی اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں سابق مشرقی پاکستان میں پروان چڑھنے والی نسل کی اس سرزمین سے بے اندازہ محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ افسانہ ایک مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ جس میں محبت کی نمی سے محروم ریتلی مٹی اور اپنوں کے رحم و مروت سے عاری سلوک کی کیفیات بھی ملتی ہیں۔ طعنہ دینے والے اور اپنی خوش بختی پر نازاں لوگ یہ نہیں جانتے کہ اپنا گھر اپنے ہاتھوں کون اجاڑتا ہے اور کون اپنے آشیانے کو خود ہی آگ لگاتا ہے لیکن اب اس خطے میں بھی جو اس کے خیالوں میں بسا ہوا تھا، اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر خیال کا یہ سفر ختم ہوجاتا ہے اور وہ تلخ حقیقتوں کی دنیا میں لوٹ آتی ہے۔ افسانہ نگار کی ایک خوبی تو اس خیال کے سفر میں اور دوسری حقیقت کی دنیا میں واپس لوٹ آنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ تقابل افسانہ نگار کے مزاج کا عکس بھی ہے اور کہانی پر اس کی گرفت کا

آئینہ بھی۔ ''آئینے کا آدمی'' ایک اجنبی ماحول کو پیش کرتا ہے لیکن اس کی بنیاد بھی ایک نفسیاتی نکتے پر رکھی گئی ہے۔

حسّانہ انیس کے یہ افسانے ایک ایسی افسانہ نگار کے افسانے ہیں جسے کہانی کہنے کا غیر معمولی سلیقہ تھا۔ لیکن جسے وقت نے اپنی صلاحیتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی مہلت نہیں دی۔ لیکن جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ کم اہم نہیں ہے۔ ان افسانوں کی اپنی دنیا اور اپنی منطق ہے۔ اس میں کسی اجتماعی آدرش سے زیادہ انفرادی صورتِ حال نمایاں ہے۔ ایسا نہیں کہ ان افسانوں میں ایثار، قربانی اور آرزوئے زندگی کے عناصر نہ ملتے ہوں لیکن یہ سب عناصر فرد کے حوالے ہی سے بیان کیے گئے ہیں۔ افسانہ نگار کی نظر نہ صرف ہر چمکنے والی چیز کو سونا نہیں سمجھتی بلکہ ہر چمکنے والی چیز اس کے لیے ایک سوالیہ نشان قائم کرتی ہے۔ کردار نگاری پر حسّانہ انیس کی خاص توجہ رہی ہے۔ لیکن کردار ایک معاشرے میں زندگی گزارتے ہیں۔ اس لیے ان افسانوں میں اجتماعی زندگی کے کئی حوالے ملتے ہیں لیکن ان حوالوں میں بھی نہ فرد سے ان کی توجہ ہٹی ہے اور نہ زندگی کے حزن میں کمی آئی ہے۔ خواہ چند جملوں میں ہی سہی حسّانہ انیس نے فطرت کی موثر تصویر کشی بھی کی ہے جو ان کے افسانوں کی مجموعی فضا سے تعلق رکھتی ہے۔ ان افسانوں میں بیانیہ سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ لیکن ان کا بیان سطح کا بیان نہیں ہے، اندرونی کیفیتوں اور ان کے اندازِ نظر کو شامل کیے ہوئے ہے۔ حسّانہ انیس نے اجزائے افسانہ کو رد نہیں کیا بلکہ ان سے اپنے افسانوں میں کام لیا اور فنی ترتیب پیدا کی ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ حسّانہ انیس زندگی کے حزن و غم کو ایسی پُر اثر تفاصیل کے ساتھ پیش کر سکی ہیں؟ شاید اس کی ایک وجہ ان کی غیر معمولی حسّاسیت ہے اور دوسری وجہ ان کا اندازِ نظر ہے، جس میں فنی ندرت بھی موجود ہے۔ اگر افسانوں کا یہ مجموعہ سامنے نہ آتا تو ہم اس کرب سے اس طرح آشنا نہ ہوتے جس کے فنی طور پر پُر اثر اور نمایاں نقوش ہمیں ان افسانوں میں ملتے ہیں۔ حسّانہ انیس کی افسانہ نگاری کی یہ ایسی خصوصیت ہے کہ جس سے اردو افسانہ نگاری میں وہ یاد رکھی جائیں گی۔

☆☆☆

حسانہ انیس کو افسانہ نگاری ورثے میں ملی تھی

ادیب سہیل

حسانہ انیس بہ کثرت لکھنے والی افسانہ نگار نہ تھیں، لیکن جب لکھا اور جتنا لکھا اچھا لکھا۔ وہ کئی طرح کی مشغولیات میں منقسم تھیں ایک طرف کالج میں اردو کی درس و تدریس، دوسری طرف کالج سے آکر بچوں کی دیکھ بھال، چولھا چکی، ظاہر ہے ان گوناگوں مصروفیتوں نے انھیں افسانہ نگاری کے لیے یک رُخا نہیں رہنے دیا۔ یہ ضرور ہے کہ اردو پڑھانے کے ناتے اردو ادب کی سرگرمیوں سے باخبر رہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشہور صوفیہ ''بی بی کمال'' کے کاکو میں ہوئی۔ حسانہ اپنے استاد مولوی محمد اسحاق کا بہ طور خاص ذکر کیا کرتی تھیں۔

حسانہ انیس اس بات پر بجا طور پر فخر کرسکتی تھیں کہ ان کا دادھیال، اور نانیھال تقریباً سو دو سو سال سے علم و ادب اور روشن خیالی کی تحریک کو پروان چڑھاتا رہا ہے۔ افسانہ نگاری انھیں ورثے میں ملی تھی۔ اُن کے والد پروفیسر مسلم نے 1916ء میں ''الناظر'' کے لیے پہلا افسانہ لکھا۔ وہ اپنے زمانے کے نامی گرامی افسانہ نگار تھے، قیام پاکستان سے پہلے کے ''ساقی'' دہلی (مدیر شاہد احمد، دہلوی) یعنی 1939ء سے پہلے کے دس سال اور بعد کے دس سال میں شاید ہی ''ساقی'' کا کوئی پرچہ ان کے افسانے سے خالی ہو۔ پروفیسر مسلم، شاہد و ''ساقی'' کے قارئین کے پسندیدہ افسانہ نگار مانے جاتے تھے۔ یہ تو ہوئی دادھیال کی وراثت

جو حسّانہ انیس کے حصے میں آئی۔ نانیھال کی طرف سے حسّانہ کے ماموں، ایک اہم ترین افسانہ نگار ڈاکٹر محمد محسن کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کا ایک افسانہ ''انوکھی مسکراہٹ'' بھی ''ساقی'' دہلی میں 1939ء ہی کے آس پاس کے سال میں چھپا تھا۔ بعدازاں ''ساقی'' کی جانب سے ''ریزۂ مینا'' کے نام سے افسانوں کی ایک انتھولوجی شائع ہوئی تو شاہد صاحب نے اس میں بھی اسے شامل کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد محسن کا ایک اور کارنامہ ان کی تصنیف ''سعادت حسن منٹو۔ اپنی تخلیقات کی روشنی میں'' (1982ء) میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ واضح رہے کہ منٹو سے ان کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر محمد محسن نے 1947ء میں اڈنبرا یونیورسٹی سے نفسیات میں پی ایچ ڈی کیا اور پٹنہ یونیورسٹی میں ان کا درس و تدریس کا موضوع نفسیات ہی رہا۔ پروفیسر اختر اورینوی بھی ان کے قریبی رشتہ دار تھے۔

حسّانہ انیس کے ہاں روشن خیالی اور انگریز استعمار مخالف تحریک انہیں اپنے والد پروفیسر مسلم عظیم آبادی کے پَردادا (صادق پور، پٹنہ کے متوطن) مولوی عنایت علی اور ان کے سگے بھائی مولوی ولایت علی کے توسط سے ورثے میں آئی۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ وہابی تحریک جس کی ایک پہچان انگریز دشمن تحریک کی حیثیت سے بھی تھی، سرحد میں مولوی سید احمد اور شاہ اسماعیل کی قیادت میں، ہزاروں مقامی مجاہدوں کے تعاون سے کامران ہوئی۔ مولوی عنایت علی و مولوی ولایت علی اپنے قائد کے دستِ راست و نائب سمجھے جاتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب 1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر مولوی سید احمد اور شاہ اسماعیل شہید ہوئے تو علی برادران (مولوی عنایت علی اور مولوی ولایت علی) نے نیابت کی ذمے داری قبول کی اور انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ اور کچھ عرصے کے لیے اس پوزیشن میں بھی آ گئے کہ انگریزوں سے واپس لیے گئے علاقوں میں امارت شریعہ قائم کی۔ لیکن یہ نیابت انگریزوں کے Divide & Rule کی مؤثر حکمت عملی کی وجہ سے ناکام ہوگئی، انگریزوں نے مقامی سرداروں کو جو امارت شریعہ کے طرف دار تھے، توڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ مولوی سید احمد کی تحریک جہاد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ مجاہدین کچھ مارے گئے کچھ اسی علاقے میں روپوش ہوگئے، کچھ چھپتے چھپاتے وطن

واپس لوٹ گئے۔ اس علاقے میں قیام کرنے والوں میں مولوی عنایت علی تھے جنھوں نے وطن واپس لوٹنے پر اُسی علاقے میں مرجانے کو بہتر سمجھا اور اُسی علاقے میں روپوشی کے عالم میں 1858ء میں انتقال کیا۔ مولوی ولایت علی صادق پور پٹنہ لوٹ آئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے خاندان کے دوسرے لوگ بھی تھے، جو انگریزوں کی وجہ سے روپوش ہوئے۔

بالاکوٹ اور نواحی علاقے کے لوگ اپنے ان عظیم محسنوں اور ان کے دارالسلام کے قیام کی تحریکوں کو اب تک نہیں بھولے ہیں۔ اس کا اندازہ اس ایک مثال سے ہوتا ہے کہ چند سال ادھر پروفیسر مسلم کی صاحبزادی حسّانہ انیس نے کراچی سے سیاحت کے لیے مانسہرہ کا سفر کیا۔ انھیں ایک زمانے سے اس بات کا اشتیاق تھا کہ بالاکوٹ اور اس کے نواحی علاقوں کو بہ نفس نفیس دیکھیں جہاں ان کے عظیم پُرکھوں نے نہ صرف انگریزوں سے جہاد کیا بلکہ ایک امارت شریعہ قائم کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ بہ قول حسّانہ انیس دورانِ سفر بالاکوٹ کے آس پاس کا کوئی ایک مقام تھا جہاں راستے کے ایک چائے خانے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چائے پینے کے لیے رکیں۔ چائے خانے میں موجود بزرگ صورت لوگوں سے حسّانہ کی بات چیت ہونے لگی۔ اس بات چیت میں مجاہدین بالاکوٹ کا ذکر آ گیا۔ اور دورانِ گفتگو انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ حسّانہ انیس صادق پور پٹنہ کے سید صاحب کے پڑپوتے کی صاحبزادی ہیں یعنی مولوی عنایت علی سے خونی رشتہ ہے تو معاً احترام میں وہ لوگ نیچے بیٹھ گئے اور سرآنکھوں پہ بٹھانے کے لیے بچھے جانے لگے۔

اس ماضی بعید وقریب کے پس منظر میں حسّانہ انیس نے افسانہ نگاری شروع کی۔ ایک افسانے اور دوسرے افسانے کے منصۂ شہود پرآنے میں طویل وقفہ ہوتا تھا اور حسّانہ انیس کا یہ حال کہ نیکی کر دریا میں ڈال کے مصداق کسی رسالہ میں بھیج دیا، اگر نیکی بارآور ہوئی تو فبہا، جب افسانہ لکھنے کی رفتار یہ ہو تو ایک کتاب بھر افسانہ جمع ہونے میں سالوں سال لگ جائیں گے۔ حسّانہ انیس کے ساتھ بھی کم وبیش یہی ہوا۔ جب انھوں نے افسانوں کا مجموعہ شائع کرنے کا سوچا تو شاید دیر ہوگئی تھی اور ان کے شوہر نامدار انیس الحق صاحب اور دوسرے

لواحقین نے افسانوں کا مجموعہ اُن کی زندگی ہی میں شائع کرنے کی تیاری شروع کر دی لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور اب جبکہ افسانوی مجموعہ شائع ہو گیا ہے تو اُس کے خیر مقدم کو افسانہ نگار خود موجود نہیں، اُن کے پس ماندگان کو یہ قلق تو بہر حال رہ گیا۔ اس قلق میں اُن کے پس ماندگان کے ساتھ میں بھی ہوں کہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جب میرا خاندان اور انیس صاحب کا خاندان کراچی آیا تو ہم لوگ دو تین مکانوں کے بُعد میں گزر بسر کے لیے کرائے کے مکان لیے۔ اِس طرح حسّانہ انیس اور ہم پاس پاس رہنے لگے، ادبی ذوق ہم دونوں میں قدر مشترک تھے، اُن کے شوہر انیس الحق صاحب بہت اچھا ادبی و نقادانہ ذوق رکھتے ہیں، یوں حسّانہ انیس اور میری بیوی کے لیے دونوں گھر ''گھر آنگن'' کے مصداق ہو گئے، دونوں گھروں کے بچے بھی صبح شام ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہے۔ دیکھتے دیکھتے کئی برس گزر گئے۔ پھر یہ ہوا کہ میں پاپوش کے ایک مکان میں منتقل ہو گیا، حسّانہ بھی کہیں اور چلی گئیں، اور ہر روز کا رابطہ گاہے گاہے میں بدل گیا۔ ہم ایک دوسرے سے بے خبر کبھی نہ رہے۔ وہ بچوں کے اچھے مستقبل پر اکثر باتیں کیا کرتی تھیں سو اُن کی یہ خواہش ہر طرح پوری ہوئی۔ بڑا لڑکا ڈاکٹر اور دوسرے بیٹے انجینئر ہوئے، ایک بیٹی بھی اپنے گھر کی ہوئی۔ اس کے لیے انیس صاحب تمام کریڈٹ اپنی بیگم حسّانہ انیس کو دیا کرتے تھے۔ انیس صاحب کی بردباری حلم، علم مثالی وہ حسّانہ کے معالے میں انھیں خوب سے خوب تر دیکھنے کے ہمہ دم متمنی۔!

انیس صاحب نے جب فون پر مجھے کہا کہ میں حسّانہ کے شائع ہونے والے افسانوی مجموعے پر کچھ لکھوں تو جیسے انھوں نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں نے فوراً حامی بھر لی، حامی بھرنے میں مجھے ایک گونہ خوشی محسوس ہوئی۔ ''آئندہ'' کے مدیر محمود واجد جو خیر سے حسّانہ کے سمدھی بھی ہیں، (واجد صاحب کے صاحبزادے کے ساتھ اُن کی صاحبزادی بیاہی گئی ہیں) انھوں نے دس افسانوں کی فوٹو اسٹیٹ مجھے حوالے کر دیں۔ یہ افسانے اردو کے جن موقر رسالوں میں شائع ہوئے ہیں ان میں ''فنون''، ''سیپ''، ''صریر''، ''سیارہ''، ''دائرہ''، ''آئندہ''، ''روشنائی'' اور دوسرے شامل ہیں۔

میرے سامنے حسّانہ انیس کا افسانہ ''بے بال وپَر'' ہے جو'فنون' لاہور سے شائع ہوا ہے۔اس افسانے کا پیرایہ تمثیلی ہے۔ یہ اُس فرد کی کہانی ہے جس کی اولادیں ایک ایک کر کے پردیس چلی گئی ہیں اور تن تنہا مفارقت کا عذاب اپنے کمرے میں پڑے پڑے سہتا ہے۔افسانہ نگار اِس عذاب کے اظہار سے افسانے کی ابتدا کرتا ہے:

''اور جب وہ اپنے کمرے میں تنہا پڑے پڑے اکتا جاتا ہےتو اپنے کمپاؤنڈ میں لگے اُس گھنے اور سرسبز درخت کے سائے میں جا بیٹھتا جو اِن دنوں اُس کی تمام دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ پہروں وہ اس کے اونچے قد، دور دور تک پھیلی ہوئی سڈول شاخوں اور اُن پر لگے ہوئے سبز چمک دار پتوں کو بہار کی سُبک خرام ہواؤں میں رقص کرتے دیکھتا، چمکیلے پتوں میں ملبوس شاخیں جیسے اِترا اِترا کر سرگوشیوں میں جوانی اور اُس کی بیتاب امنگوں کی باتیں کرتیں، نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے دودھیا بادلوں کی سبک خرامیوں پر جھومتیں اور ہوا کے زور سے یوں تن جاتیں جیسے بادلوں کو چھولیں گی۔ جوانی سے سرشار اس تناور درخت کی ایک ایک ادا میں وہ پہروں گم رہتا......''

میں نے اس افسانے کی شاعرانہ زبان کی کیفیات سے لطف اندوز ہونے کے لیے دوبارہ پڑھا، اس کے تمام ابواب مجھے نثری نظم لگے، ذرا ردوبدل کے ساتھ اس بات کو دوبارہ تحریر کردیا جائے تو اچھی خاصی نثری نظم لگے۔حسّانہ انیس کی زبان اتنی مربوط اور کسی ہوئی ہے کہ جیسے سُر میں کیا ہو کوئی تار کا ساز ہو! چڑیوں کی تمثیل میں کمرے میں تنہا پڑے رہنے والے شخص کی روداد غم افسانے کے ہر باب میں ایک نیا منظر دکھلاتی ہوئی انجام کو پہنچتی ہے: انجام سے پہلے یہ جملہ دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے:

''دوسرے بچے نے بھی اڑان لی اور اُڑ کر اُسی طرف چلا گیا جدھر پہلا گیا تھا''

اب آخری منظر نامہ یہ بنتا ہے کہ وہ شخص جو جوڑوں میں شدید درد اور چبھن محسوس کرتا ہے، ہکپاؤنڈ سے کمرے تک جانے کی تاب بھی اس میں باقی نہیں رہی ہے، اور چڑا جس کے بچے ایک ایک کر کے گھونسلہ خالی کر گئے وہ شدت غم سے چوں چوں کیے جاتا ہے۔ ادھر

گرم ہوا کے تھپیڑوں سے ٹیبل پر رکھے ہوئے اس شخص کے بیٹوں کے تازہ آئے ہوئے خطوط بکھر کر دور پڑے ہیں۔ وہ انہیں پکڑنے کے لیے پوری قوت سے جھپٹا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑا۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے اپنی ناکامی کا کہ حسّانہ دریافت بھی ہوئیں تو کس وقت؟ میں انھیں افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتا تو برسوں سے تھا۔ لیکن پہچاننے کی منزل سے اب گزرا ہوں جب اُن کے کئی افسانے ایک ساتھ پڑھنا نصیب ہوا۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ فنکار سے اتنی قرابت کے باوجود اُس کے فن سے آخر کیوں اتنا دور رہا۔

حسّانہ انیس کا دوسرا افسانہ ''سنگ سار'' ۔ یادِ ماضی عذاب ہے یارب کی کھلی تصویر و تفسیر ہے۔ کہانی کی متکلم ایک ایسا سکّہ ہے جس کے دو رُخ عامر اور محسن ہیں۔ عامر سے اِس کا تعلق رفاقت کا ہے جو عامر کے لاپتا ہو جانے کی وجہ سے منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب افسانے میں زیرِ بحث خاتون کی زندگی میں محسن داخل ہو جاتا ہے، اِس تعلق کے برسوں گزر جانے کے باوجود وہ، عامر اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے شب و روز بھلائے نہیں بھولتی۔ اور فراق لمحوں کو کسی نہ کسی عنوان یادوں میں بسائے رکھنا اور اس کی بازیافت کرتے رہنا ہی اب اس کا من پسند شغل ٹھہرا ہے۔

عامر کی یادوں کا سلسلہ اپنی جگہ قائم ہے اور محسن دس برسوں سے تا حال جیون ساتھی ہے۔ محسن نے بھی خاتون کی دل داری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ دس برس کے بعد ایک روز عامر دروازے پر دستک دیتا ہے متکلم خاتون دروازہ کھولتی ہے تو حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی یہ دیکھ کر کہ اُس کے سامنے عامر کھڑا ہے۔ وہ اُسے دیکھ کر نہال ہو جاتی ہے۔ رفاقتوں کے خواب لمحے دہرائے جاتے ہیں۔ بہرحال عامر اُسے دوبارہ اپنا بنانے کا عندیہ دے کر چلا جاتا ہے۔ متکلم خاتون ایک کشمکش میں ہے۔ وہ اب محسن کے ساتھ برسوں سے ایک رفاقت کی زندگی گزار رہی ہے۔ وہ اب کسی نئے تجربے سے گزرنا نہیں چاہتی وہ خود میں اب اس کام کے لیے دم خم نہیں پاتی۔ بہرحال اب پھر وہ دو کشش ثقل کے درمیان آن پھنسی ہے۔ اُس کا ذہن ایک عجب نا قابل برداشت ہیجان میں مبتلا ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ اسی عالم میں اس کے نام دو

لفافے ایک ساتھ آتے ہیں۔ عامر نے اس کی پُرسکون اور پُر آسائش زندگی کو مفلوک الحالی میں تبدیل نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اُس نے باضابطہ طلاق سے نوازا تھا۔ متکلم خاتون نے شدید اضطراب کے عالم میں محسن کا خط کھولا ''اس نے لکھا تھا کہ بھٹکے ہوئے پرندے کو اگر اس کا گھونسلہ مل جائے تو پرندے کی اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ واپس اپنے گھونسلے میں چلا جائے۔ محسن نے لکھا تھا کہ تم میری طرف سے آزاد ہو'' ستم بالائے ستم یہ کہ خاتون نے ردِعمل کی تاب نہ لا کر میز کی دراز سے خواب آور گولیوں کی شیشی نکالی اور اپنی ہتھیلی پر انڈیل کر گنے بغیر نگل گئی پھر اُس نے پانی کا بھرا ہوا گلاس اٹھایا اور ایک سانس میں خالی کر دیا۔

کہانی کے اختتام پر معاً قاری کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کہیں خاتون نے اَن گنت خواب آور گولیاں کھا کر دوطرفہ پریشانیوں سے دائمی نجات تو حاصل نہ کر لی!

حسانہ انیس کا تیسرا افسانہ ''منزل ہے کہاں تیری'' ہے جو سہ ماہی ''سیپ'' کراچی میں چھپا ہے۔ یہ پوری کہانی مکالمے سے شروع ہوئی اور مکالمے پر ختم ہوئی ہے۔ کہانی کار نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مکالمے رواں اور برجستہ ہوں۔

کہانی کا منظر یہ ہے کہ ایک برگد یا پیپل کا درخت ہے وہاں لوگوں کا ہجوم ہے، ہجوم درخت کی شاخوں کو ایک ایک کر کے کاٹتا جاتا ہے۔ شاخوں کے ساتھ اُس کے ماننے والے بھی کاٹے جا رہے ہیں۔ مکالمہ کرنے والوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ یہ برگزیدہ درخت جو کپل وستو کے شہزادہ کے حوالے سے کبھی آدرمان کا مستحق ٹھہرا تھا، جس کے نیچے شہزادے نے نروان حاصل کیا تھا وہ آج اس درجہ معتوب کیوں ہوا ہے؟ امن و سلامتی اور خیر و برکت کے اس پیڑ کو جڑ سے کاٹنے کا نعرہ لگ رہا ہے۔ برہمنیت کپل وستو کے شہزادہ کے نروان سے حاصل کیے مت کو ''ہندواستھان'' سے دیس نکالا کر دینا چاہتی ہے، برہمنوں نے اس کے لیے خون خرابہ کا راستہ اختیار کیا۔ بدھوں کے ویہارے اور استوپے تباہ کیے گئے۔ ان سب کے باوجود آج جنوب مشرقی ایشیا پر نظر ڈالیں تو چین، جاپان تک بدھ مت ہی پھلتا بڑھتا چلا گیا ہے، اور برہمنیت باہر تو کیا پھیلتی اپنے گھر میں بھی سکڑتی ہوئی ایک نقطے پر جم کر رہ

گئی ہے۔ اور کپل وستو کے شہزادے کی امن وسلامتی کا پیغام گیا اور نالندا سے نکل کر ٹکسلا سے ہوتا ہوا پورے جنوبی ایشیا پر چھایا ہوا ہے۔ دوسری تشریح تشکیلِ پاکستان اور قائداعظم کے حوالے سے ہوسکتی ہے۔

حسّانہ انیس کی چوتھی کہانی ''واپسی'' ہے۔ واپسی ایک عورت کی یادوں کی بازیافت کی کہانی ہے۔ اس کی شروعات یوں ہوتی ہے کہ جب وہ اُس سرزمین میں دوبارہ جاتی ہے جسے برسوں پہلے چھوڑنے پر مجبور ہوئی تو اسے محسوس ہوا کہ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا سب کچھ ویسا ہی ہے۔ اُسے محلے دار روشن علی بےطرح یاد آیا جو اپنی جان پر کھیل کر کتنی ہی میلی آنکھوں سے اُسے بچانے کے لیے رحمت کا فرشتہ بن گیا تھا۔ اس عورت کی ڈھاکہ کے المیہ واقعات کا سرا یاد کی انگلیوں میں کیا آیا کہ پورا گولا کھلتا چلا گیا۔ اس سے کہانی کار عورت کو اُس وقت نجات ملتی ہے جب کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے۔ دستک دینے والا اُس کا شوہر ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ حسّانہ کے بیشتر افسانوں کا اختتام ایسے ہی ڈرامیٹک ہوتا ہے۔ افسانوں کا اختتام معلّق معلوم نہیں ہوتا، کہانی کی ماجرہ کاری سے جڑا رہتا ہے۔ کہانی کوئی بھی ہو، حسّانہ انیس کے ہاں ''یادوں کی بازیافت'' ایک تکنیک کی طرح استعمال ہوتی ہے۔

حسّانہ کے اکثر معاصر افسانہ نگاروں کے بیان میں اکھڑے پن کا احساس ہوتا ہے لیکن حسّانہ کے بیان اور بُنت کاری میں ایک تسلسل، جماؤ اور سجاوٹ ہوتی ہے، اِس احتیاط کے ساتھ کہ وہ آورد کا حصہ نہیں بلکہ آمد کا حصہ معلوم ہو۔ حسّانہ کا قلم محض تماشائی کا قلم نہیں، وہ افسانوی منظر کا تماشا، مشاہدے کی سطح پر کرتی ہیں، تجربہ بھی ممد ہوتا ہے، افسانوی منظرنامے میں اُن کا مطالعہ پوری جزیات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ کردار کے معمولی سے معمولی حرکات و سکنات بھی نظرانداز نہیں ہونے پاتے اور افسانے میں ان خصوصیات کا در آنا، گہرے اور غایر مطالعے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میرے اس اخذ نتیجہ کی بنیاد حسّانہ کے افسانے ''سنگ سار'' اور ''بے بال و پر'' بھی ہیں۔ یہ افسانے انگریزی مقولے Morning Shows the Day کی مظہر ضرور ہیں، لیکن حسّانہ کی دوسری مصروفیات افسانہ نگاری پر اس طرح حاوی رہیں کہ اُن پر

پوری طرح دن نکلا ہی نہیں۔ اگر اُن پر افسانہ نویسی کا دن پوری طرح ظاہر ہو پاتا تو ان کا مستقبل نہایت تابناک ہوتا۔

حسانہ انیس کا پانچواں افسانہ ''ڈوبتی ہوئی پہچان'' اُس عصری حسیت اور مسائل سے جڑا ہوا ہے جو آج کے دور میں پاکستان کے تقریباً ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ والدین بچوں کو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں، اُن کے اچھے مستقبل کے لیے انھیں اعلیٰ تعلیم دلواتے ہیں، اُن کی ناموری کے خواب دیکھتے ہیں اور اِس خواب سے سو اُمیدیں باندھتے ہیں، پھر جب بچے اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہو چکتے ہیں تو اعلیٰ مستقبل کے لیے پردیس سدھار جاتے ہیں۔ پھر والدین جو بچوں کو ایک پل نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے، اُن کی آنکھیں اپنے دل کے ٹکڑوں کے لیے جو پردیس میں براج رہے ہوتے ہیں، برسوں ترستی رہتی ہیں۔ برس دو برس میں اُن بچوں میں کوئی واپس آتا بھی ہے تو آنے کی خوشی کے ساتھ والدین کے لیے اپنے واپس جانے کا دکھ بھی لے آتا ہے۔ ان پر 'آمدن بہ ارادت اور رفتن بہ اجازت' کا محاورہ لاگو نہیں ہوتا۔ یہ آنا جانا اُن بچوں کے ارادوں کے تابع ہے۔ اور والدین جب تک زندہ رہتے ہیں، قسطوں میں اولاد کی مفارقت کا دکھ جھیلتے رہتے ہیں۔ کم و بیش یہی پس منظر حسانہ کے غم کا بھی تھا۔

آخری کہانی میں وہ عورت بھی نظر آ رہی ہے جس کے شوہر کی مصروفیت شروع دن سے ایسی رہی کہ اسے اپنے ''نصف بہتر'' کے حسب خواہش اس پر دھیان دینے یا ملتفت ہونے کا موقع کم ملا اس کے باوجود کہ رفاقت شاخ در شاخ پھولی پھلی۔ اُس کے شوہر کا اگر کچھ قصور ہو سکتا ہے تو یہ کہ اُس کی مصروفیت، رفاقت کے درمیان رقیب بن کر حائل ہو گئی۔ اس کہانی کو کہانی کار کا سوانح بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ سوانح بیشتر براہ راست بیان ہوئے ہیں، اور کہیں پوسی کی تمثیل بھی کام آئی ہے۔ اس باب میں حسانہ انیس کا چرند و پرند کا نفسیاتی مطالعہ بھی گہرا اور قریبی ہے۔ یہ موضوعِ افسانہ، پرندوں کے حوالے سے ان کے افسانے ''بے بال و پر'' میں کمال کا Depict ہوا ہے۔

حسانہ انیس درس و تدریس میں داخل ہونے کے ساتھ ہی پی ایچ ڈی کے حصول کا

ارادہ رکھتی تھیں، انھوں نے ''افسانے میں دیہات کا کردار'' موضوع کے طور پر منتخب کیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ لاہور، پنڈی اور سرگودھا کے ادیبوں اور افسانہ نگاروں سے تبادلۂ خیال کا منصوبہ بھی مرتب کر رہی تھیں۔ بہرحال ستر کی دہائی کے آخر میں اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے گھر سے چل پڑیں۔ اس سفر میں حَسّانہ کے ساتھ شاہد کامرانی، خاکسار اور محمود واجد تھے۔ لاہور پہنچے، ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ حَسّانہ انیس کی معیت میں جناب احمد ندیم قاسمی اور محترم غلام الثقلین نقوی سے ملے۔ پنجاب کے دیہات پر ان دونوں نے بہتر سے بہتر افسانے رقم کیے ہیں۔ مسعود اشعر اور انور سجاد نے ایک ہوٹل میں چائے پر بلایا۔ کچھ اور ادیبوں سے بھی ملے۔ کشور ناہید سے ''ماہِ نو'' کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ بعدازاں داتا دربار میں حاضری دی۔ دن بھر کے تھکے تھے اور اگلی صبح سرگودھا کے لیے روانہ ہونا تھا۔ محمود واجد صاحب اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا سے رابطہ کر چکے تھے۔

دوسرے دن دوپہر کو ہم لوگ آغا صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بنگلے کے خاص دروازے پر کھڑے ملے۔ آغا صاحب کے ملازمین میزبانی کے آداب سے واقف تھے۔ ہمارا سامان انھوں نے ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر ایک کمرے میں رکھا۔ دوسرا کمرا جو ڈرائنگ روم کے کام آ رہا تھا، ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ہم سب وہیں بیٹھ گئے۔ پھر محمود واجد نے کمرے کی چاروں دیواروں کی کارنسوں پر نظر دوڑائی۔ وزیر آغا مسکرائے ''یہ اسلامائزیشن سے پہلے کی ہیں۔'' ہر طرف رقص کے مختلف پوز میں فریم کی ہوئی خوبصورت تصویریں تھیں۔ (یہ جنرل ضیاء الحق کا دور تھا)۔ چائے آ گئی، چائے نوشی کے دوران ادب پر عمومی گفتگو ہوتی رہی، پھر آغا صاحب نے حَسّانہ انیس سے پوچھا کہ آپ نے مقالہ کا synopsis ساتھ لایا ہے، حَسّانہ جیسے اس سوال کے لیے تیار بیٹھی تھیں، فوراً بیگ سے ''سیناپ سس'' کے کاغذات نکال کر آغا صاحب کو پیش کیے۔ انھوں نے تحریر پر نظر ڈالی اور موضوع کی ضروریات کی نشاندہی کرتے رہے۔ اسی دوران میں یہ بات بھی آئی کہ ڈاکٹر انور سدید بھی اسی قسم کے موضوع پر ایک کتاب رقم کر رہے ہیں۔ شام کو سرگودھا کے کچھ اور

ادبی احباب جناب غلام جیلانی اصغر، اور سجاد نقوی ملاقات کے لیے تشریف لے آئے، آغا صاحب نے اِن احباب سے ہم سب کا تعارف کرایا، پھر حسّانہ انیس کی آمد کی غایت بیان کی، اور گفتگو اُسی طرف چل پڑی۔ سب نے اپنے اپنے انداز میں ''افسانہ نگاری میں دیہات'' کے موضوع پر باتیں کیں، بہت سی مفید اور قابل ذکر معلومات سامنے آئیں۔

سرگودھا میں چوبیس گھنٹے قیام کے بعد ہم لوگ راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں بھی ایک دن قیام رہا۔ رشید امجد، منشا یاد، احمد داؤد اور دیگر دوستوں سے ''افسانہ نگاری میں دیہات'' کے موضوع پر تبادلۂ خیال ہوا، حسّانہ انیس کے لیے یہ ملاقاتیں اور سفر بالکل نیا تھا۔ حسّانہ انیس کو اِن احباب کے نقطۂ نظر سے خوب خوب مستفید ہونے کا موقع ملا۔ کیونکہ یہ سب کے سب اردو ادب میں بہ حیثیت افسانہ نگار معروف لوگ ہیں۔

حسّانہ انیس کا یہ منصوبہ کاغذی تیاریوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کیا مشکلات پیش آئیں اس کا مجھے علم نہ ہو سکا۔ بہرحال، ان کا پی ایچ ڈی کرنے کا منصوبہ مکمل نہ ہو سکا۔ اس سے ایک قابلِ قدر کام اردو ادب کے ریکارڈ پر نہ آ سکا۔

حسّانہ انیس اب ہم میں نہیں ہیں، مگر لگتا نہیں کہ وہ ہم سے دور ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ابھی ابھی وہ میرے گھر میں مہکتی، بکستی، مسکراتی وارد ہو جائیں گی۔ اُسی تخت پر بیٹھ جائیں گی جس پر میری بیگم بیٹھی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ حسانہ کو دیکھ کر نہال ہو جائیں گی۔ پھر خاندان کی بچیوں اور بچوں کی شادی بیاہ کا چرچا چل نکلے گا۔ اِدھر بچیاں حسّانہ چچی کی خوبصورت باتیں سننے کے لیے حلقہ بگوش ہو جائیں گی، اُدھر اُن کے بچے بھی والدہ کی تلاش میں ڈولتے ہوئے آ کر پاس بیٹھ جائیں گے اور ایک اچھی خاصی محفل جم جائے گی۔

ہمیں ایسا اس لیے بھی لگتا ہے کہ حسانہ انیس کی تحریریں ہمارے درمیان زندہ ہیں۔ یہ تحریریں اُن کے بچوں اور بچوں کے بچوں میں تا دیر اِسی طرح زندہ رہیں گی اور افتخار کے ساتھ یاد کی جائیں گی جس طرح اُن کے جدامجد مولوی عنایت و مولوی ولایت علی کی توقیر اُن کے پرستاروں میں آج تک زندہ و پابندہ ہے۔ ☆☆☆

حسّانہ انیس کی فِکشن میں فَن شناسی

محمود واجد

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں انگریزی فکشن کے معروف نقاد پرسی لبوک نے اپنی معروف کتاب The Craft of Fiction کے دیباچے میں لکھا تھا:

''آرٹ پَروں والا لفظ جسے پکڑنا یا باندھنا مشکل ہے کہ یہ ہمیشہ موضوع گفتگو سے پھسل جانے کو تیار رہتا ہے اور جسے اس کی اپنی بنیاد پر قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔''

اس بات کا مفہوم صرف اتنا تھا کہ آرٹ فارم اپنے کرافٹ سے مرتب ہوتا ہے اور مکمل تفہیم ہونے پر ہی کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کا قطعی یہ مطلب نہیں تھا کہ کرافٹ سیکھیے اور پھر فن کی طرف آیئے۔ دراصل آرٹ کے عامل کے کام کو مشکل بتانا مقصود تھا۔ اس کے لیے کسی درس گاہ میں داخلہ کی شرط بھی ضروری نہیں تھی بلکہ آرٹسٹ میں جذبے کا ہونا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ کتاب کی ابتدا ہی عجیب انداز میں ہوئی تھی:

''دھندلی اور تصوراتی ہیئت کو قابو میں کرنا ایک دم سے نقاد کے لیے بھی ممکن ہیں جو ایک کتاب میں ہوتا ہے۔ کوئی طاقت ایسی کتاب کو منجمد اور بے حرکت نہیں بناسکتی، دھیرے دھیرے اس کی شکل واضح ہوتی

ہے، جیسے جیسے دوبارہ ورق گردانی کی جاتی ہے باتیں واضح ہوتی ہیں
لیکن سب کچھ نہیں، کچھ مبہم رہ جاتا ہے۔ جتہ جتہ ہم آگے بڑھتے ہیں
اُس کا مواد گھل کر یادداشت کا حصہ بن جاتا ہے یہاں تک کہ آخری
صفحہ اور اس کی تفصیل پڑھ کر بھی سب کچھ عیاں نہیں ہوتا۔ دنوں اور
مہینوں میں دھند چھٹتی ہے اور بہت کچھ دِکھنے لگتا ہے۔''

یہ باتیں میں اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ بتا سکوں کہ فکشن محض قصہ نہیں ہے۔ قصہ کہانی میں بھی فکشن ہے یہاں تک کہ داستانوں میں بھی مگر کچھ اور طرح کا۔ ان کی تخلیق کے تقاضے اور جواز بھی کچھ اور ہیں۔ فکشن جسے ہم افسانہ اور ناول میں دیکھتے ہیں زندگی جیسا ضرور ہے مگر یہ عین بہ عین زندگی نہیں ہے۔ گویا باضابطہ سمجھنے کی کوشش اور اخذ کرنے کی صلاحیت ہی تخلیق کی معنویت کی لطف اندوزی تک لے جاسکتی ہے۔ لکھنے کی اہلیت تو بہرحال آگے کی چیز ہے۔

مغرب کا فکشن تو اٹھارویں صدی میں قائم ہو چکا تھا ناول کی حد تک لیکن باضابطہ افسانہ انیسویں صدی کے وسط میں مستحکم ہوا۔ ہمارے یہاں مشرق میں اور خاص طور سے اردو زبان میں بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں افسانہ باضابطہ وجود میں آیا۔

ہمارے دورِاول کے افسانہ نگاروں کی نسل نے آس پاس آنے والوں کو بڑا متاثر کیا تھا۔ ان میں ایک اہم نام پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کا تھا جو ادب کے استاد ہی نہیں ادیب، شاعر اور افسانہ نگار بھی تھے۔ یہ ''الناظر'' لکھنؤ، ''ندیم'' گیا اور ''ساقی'' دہلی میں مسلسل چھپ رہے تھے (1916ء سے 1943ء کے عرصے میں)۔ پروفیسر محمد مسلم، حضرت سید احمد شہید کے اولین خلفا کے خانوادے سے تھے جو علمائے صادق پور کہلاتے تھے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ (غیر مطبوعہ) میرے سامنے ہے۔ اس کا دیباچہ انہوں نے خود لکھا ہے۔ چند فقرے ملاحظہ ہوں:

''افسانوں میں جگ بیتی اور آپ بیتی نہ ہوتو ان میں اصلیت کی تاثیر

پیدا نہیں ہوتی مگر خطرہ یہ ہوتا ہے کہ عوام ان کو ذاتی واردات سمجھ لیتے ہیں اور اعزا و احباب ذاتیات کے افشا یا تضحیک و توہین کا شبہ کرنے لگتے ہیں۔‘‘

پروفیسر مسلم کی چھوٹی بیٹی پروفیسر حسنا نہ انیس نے جب افسانہ نگاری شروع کی (1969ء) تو ایسا کوئی خدشہ نہ تھا کہ اردو میں رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک اور جدید تحریک نے اپنے اپنے رنگ جما لیے تھے گو یہ حقیقت اپنی جگہ پر تھی کہ عصری زندگی سے اخذ کردہ مواد میں خود لکھنے والا/ والی کہیں موجود نہ ہو یہ ممکن نہیں لیکن یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ فنکار تو کہانی کی قلب ماہیت سے گزر کر ہی تخلیق کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے۔ ابتدائی مرحلے میں ہی اُن کے اپنے محمد مسلم، ڈاکٹر محسن، اختر اور رینوی، شکیلہ اختر ماڈل رہے ہوں گے۔ پھر انہوں نے خود ادیب کامل اور ایم اے اردو ادب کی سندیں حاصل کیں اور ادب پڑھانے پر مامور ہوئیں اور بہت کامیاب استاد اور اچھی منتظم ثابت ہوئیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کی خدمات کو حاصل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ ان کے شوہر جناب انیس الحق بھی بنارس ہندو یونیورسٹی اور قائداعظم کالج ڈھاکہ کے استاد رہے تھے۔ گویا ایں خانہ ہمہ آفتاب است کے مصداق ان کے بیٹے بیٹیوں نے بھی اعلیٰ ترین سندیں حاصل کیں اور کئی ملکوں میں گھر بنا چکے ہیں۔

افسانے میں یہ ان کی ذہانت کا کرشمہ ہے کہ کم سے کم لکھ کر زیادہ سے زیادہ کی حقدار پائی گئیں۔ وراثت کے علاوہ عصری حقائق انہیں ایسے ملے کہ بار بار بننے اور بگڑنے کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا ایک دم سے ان کے سامنے نہیں آ گئی۔ ذاتی طور پر انہیں دو ہجرتوں سے گزرنا پڑا، مغربی ملکوں کے دو طویل سفر ان کے وژن کے تنوع میں معاون ثابت ہوئے۔ غلامی سے آزادی کا سفر، تقسیم در تقسیم کے المیے کی عینی شاہد، انسانی رویوں کے مدوجزر کا ان کا اپنا مشاہدہ مسئلہ ہی نہیں بلکہ دنیا کو ہر حال میں برتنے کا تجربہ بھی انہیں حاصل ہوا جو اُن کے خاندان کی کشتی کو بحفاظت بچا لے گیا لیکن اس تگ و دو میں اتنی ہلکان ہوئیں کہ اپنی جان گنوا بیٹھیں اور آج اپنی کاوشوں کی داد خود لینے کو ہمارے درمیان موجود نہیں۔

ابھی پچھلے دنوں میں اپنی بیٹی کے پاس ابوظہبی جارہا تھا کہ اُن کا فون آیا: ''سنا ہے میری کتاب آرہی ہے یقین نہیں آرہا کہ میری زندگی میں آئے گی۔'' میں نے کہا آپ جی کر تو دیکھیں میں آپ کی کتاب لارہا ہوں۔ مہینہ بھر رہ کر واپس آیا تو موذی کینسر نے انہیں اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا اور اگلا مہینہ انہیں دیکھنا نصیب نہ ہوا! ایسی نفیس، ایسی باذوق، ایسی باوقار، ایسی محبت شناس شخصیتیں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہوں گی۔ میں نے تو ان سے ان کی زندگی میں ہی یادگار کے لیے اپنے بیٹے کے لیے اُن کی بیٹی مانگ لی تھی جس سے ہمہ وقت انہیں کسی زاویے سے دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

فکشن کے فن کے سلسلے میں ان کی شناسائی اردو ادب میں گہری جڑیں رکھتی ہے۔ میرے سامنے ان کے افسانے ہیں جو ہندو پاک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ کچھ میں نے شائع کیے ہیں باقی دوسرے لوگوں کے یہاں آئے ہیں۔ اُن کا موت کی طرف اتنی تیز پیش قدمی کا احساس مجھے قطعی نہ تھا۔ اتنی باتیں اتنی یادیں ہیں کہ سب کو سمیٹنا مشکل ہے۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) سے یہاں آتے ہی میری شریک حیات برین ہیمرج اور فالج کا شکار ہوئیں اور کوئی چودہ برس بعد رخصت ہوگئیں۔ کیسے سنگین مسائل تھے۔ میرے پانچ بیٹے بیٹیاں تھیں اور اُن کے بھی پانچ پھر دو اور ہوئے۔ دونوں کے مسائل تھے۔ کس طرح ہم مشترک قسم کے مسائل سے دوچار ہوئے اور کس طرح ہم دونوں نکل آئے یہ ان کے مشورے اور تعاون کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اسی طرح اُن کے شوہر کے خصوصی تعاون سے سب اپنی اپنی راہ پر لگے۔ اُن کا اپنا پی ایچ ڈی کا تھیس درمیان میں اٹک گیا۔ ''اردو افسانوں میں گاؤں اور شہر کی پیش کش'' پر اُن کے گائڈ ڈاکٹر کشفی نے ڈاکٹر صبیحہ حفیظ (معروف شاعر حفیظ ہوشیار پوری کی بیٹی) شعبہ سوشیالوجی کو ڈائریکٹر مقرر کرایا۔ صبیحہ حفیظ نے بہت سی کتابیں اُس موضوع پر انگریزی میں پڑھوائیں اور کافی نوٹ تیار ہوگئے۔ Taboos, Totum اور جانے کیا اَلا بَلا جو اس سماجی جانور (انسان) کو سمجھنے کے کام میں آتے تھے خواہ وہ گاؤں کا ہو یا شہر کا ہو۔ اس کا کچھ حصہ کہیں گم ہوگیا۔ بڑی بدظن ہوئیں اور سند ہاتھ سے نکلتی ہوئی لگی۔ مگر محنت کام آگئی۔

سند تو نہ ملی لیکن معاشرتی علوم کا سرمایہ کالج آف اکنامکس میں طالبات کے کام آیا۔ وہاں انہوں نے اردو ادب نہیں پڑھایا۔قدرت کس طرح کام لیتی ہے انسان سے اور کیسے کیسے!

گیارہ افسانوں میں پہلا افسانہ ''طوفان میں ٹھہرا ہوا لمحہ'' حسّانہ انیس کی فن شناسی کی راہ دکھاتا ہے۔قصہ، کردار، پلاٹ، زماں، مکاں، تاثر۔ کیا یہ سب کچھ مل کر افسانہ بن جاتا ہے؟ ہاں کہنے کی ضرورت پر آپ حیران نہ ہوں کہ ابھی مقدار کا طے ہونا باقی ہے۔ حسّانہ جانتی ہیں کس کو کس مقدار میں کہاں رکھنا ہے کہ وحدتِ تاثر کی بنیادی شرط قائم رہے۔ ذہن کو جھٹکا لگے مگر ذہن معطل نہ ہو جائے۔ سیدھی شفاف راہ دکھائی دینے لگے۔ انسانی المیہ کا رُخ واضح ہو جائے کہ سب کچھ اختیار میں نہیں۔ جو چیز جیسی نظر آتی ہے ویسی ہی ہو بھی ضروری نہیں۔خوشی کا مفہوم سب کے لیے یکساں نہیں۔آ گہی حاصل ہو جائے یہ بڑی بات ہے!

مجھ سے پہلے لکھی گئی تحریریوں میں میں دیکھ رہا ہوں کہ مستند نقادوں نے افسانوں کو عموماً پسند کیا ہے۔ بعض نے دل سے، بعض نے دماغ سے، بعض نے برتاؤ کے ذریعے۔اب میں کیا کروں کہ ان کا جواز تو بہر حال ڈھونڈنا ہے۔فن پر گرفت کی وضاحت چاہوں گا۔ کاش وقت ساتھ دے! بہر حال، وحدتِ تاثر اتنا شدید ہے کہ پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ پلاٹ انتہائی گٹھا ہوا، مرکزی کردار انتہائی تیکھا اور مضبوط، واقعہ بظاہر معمولی مگر سنگین، خیال کا ارتقاء انتہائی فطری، نقطۂ عروج پر بجلی کی سی چمک سے سارا منظر روشن ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کا شمار اردو کے اہم افسانوں میں ہونا چاہیے۔

''نائٹ میئر'' ایک اور رُخ سے زندگی کو دکھاتا ہے۔ کشاکش اور جہد مسلسل سے بھری ہوئی زندگی ایک بھیانک خواب کے استعارے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انتہائی خلوص سے لگایا ہوا اور محنت سے سینچا ہوا پودا بھی بے ثمر ہو سکتا ہے اگر اس کی نمو اور اٹھان کی آ گاہی نہ ہو۔ جہدِ محض بے فیض بھی ہو سکتا ہے۔ یہ نہایت ہی سبق آموز نکتہ ہے۔ دیانت داروں کے لیے کیا کہ کیا نیکی ترک کر دی جائے اگر اس کا اجر نہیں ملتا۔ یہ بجائے خود انعام ہے۔ کردار سازی پر مصنفہ کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ان سے بڑے کردار کی تخلیق کا امکان بڑھتا تھا مگر

حیف وہ نہیں ہیں۔

''سنگ سار'' محبت وایثار پر مبنی ایک اور طرح کا افسانہ ہے جس میں اتفاقات وفا اور بے وفائی کے حدِ فاصل کو مٹا دیتے ہیں اور غلط فہمی کی قیمت جان کا نذرانہ پیش کر کے ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ افسانویت کا گہرا شعور اور ماحول سازی میں مصنفہ کا کمال حد درجے کا ہے کہ وہ خود کو سنگ سار کر کے نجات چاہتی ہے۔ دراصل یہ خود رحمی کی یہ عجیب تمثیل ہے۔

''بے بال و پَر'' میں فطرت کے تفصیلی بیانیے میں ایسی جزئیات شامل ہیں جو نزدیک اور مسلسل مشاہدے کی آنکھ سے ہی منعکس ہونا ممکن ہے۔ لیکن یہ تو محض پس منظر ہے اصل المیہ تو فطرت سے کٹ جانے کا ہے جو شہری اور غیر ملکوں کا باشندہ ہونے پر فخر محسوس کرنے والی نئی نسل کا نمائندہ ہے اور پیچھے رہ جانے والی بوڑھی نسل کی بے بسی کا نوحہ ہے کہ تمام آسائشوں اور فطرت کی گود میں بیٹھے ہوئے بھی نئی نسل کے ننھے منے بچوں کے لمس اور آوازوں سے محروم شخص کا مقدر بنی ہیں۔ چڑیا چڑے کی کہانی سے ہمارے ابتدائی فکشن لکھنے والے یلدرم نے جو کام لیا تھا اس کا ترقی یافتہ version نئے وژن کے ساتھ اس میں موجود ہے۔ اس افسانے میں جزیات نگاری اپنے کمال کو پہنچی ہے۔ یہ مصنفہ کے ذاتی مشاہدے کی توسیع محسوس ہوتی ہے۔

''ڈوبتی ہوئی پہچان'' میں فطرت سے کٹ جانے کا المیہ ایک بڑے کینوس پر پینٹ کیا ہوا آرٹ ہے۔ اس کا بیانیہ زیادہ انسانی زیادہ گہرا اور تادیر رنجیدہ کر دینے والا ہے۔ لق و دق مکان یا کوٹھی، درخت، پودے، بیلیں، پالتو بلی، موسموں کی شدت، گھٹتی ہوئی زندگی، کھوئی ہوئی پہچان ایسا منظر تیار کرتی ہیں کہ زندگی کرنے اور زندگی سے بچھڑنے کا احساس گڈمڈ ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ گویا ہونا اور نہ ہونا ایک جیسے عمل بن گئے ہوں۔ ماضی کی عظمت اور حال کی رخصتی کا منظر ہمیں اندر سے ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ کھڑکی سے جیسے منظر آ جا رہا ہو۔ یہ مرکزی افسانہ بھی ہے اور شناخت کی گمشدگی کا نوحہ بھی۔ حسنا نہ کے بچپن کا ہزاری باغ آج بھی جھارکھنڈ میں موجود ہے مگر اس کی بازیافت کراچی میں ہو رہی ہے۔ ذہین فطین افسانہ نگار

کے ہاتھوں! قتین اس لیے کہ ایسا لگتا ہے جیسے ٹھہرے ہوئے تالاب میں ایک دم سے بہت سے کنکر مارے گئے ہوں اور بہت سارے دائرے اُبھر آئے ہوں۔

''گلدان'' میں بھی موسم اور فطرت یکجا ہیں لیکن ایک اور انداز ے سے۔ تشکیل پاکستان اور تقسیم در تقسیم کا المیہ اس میں رقم ہوا ہے اور معروضی حقائق کو موضوعی تنوع سے زیادہ بامعنی بنایا گیا ہے اور جینے کی امنگ کو فتح یاب دکھایا گیا ہے۔ گویا اصل شے اپنے ہونے کے احساس کی لگن ہے مگر کس طرح افسانہ پڑھیے اور محسوس کیجیے۔

''رات سے پہلے'' ایک اور طرح کا المیہ انسانی رشتوں کی عدم تفہیم سے برآمد ہوتا ہے۔ مختصر مگر جذباتی لہروں کا ٹکراؤ اور خوبصورت موڑ بھرپور زندگی کی تجسیم کرتا ہے۔

''منزل ہے کہاں تیری'' تقسیم در تقسیم کا المیہ رقم کرتا ہے، مگر یقین نہیں کھوتا کہ ہم ہیں اور ہوں گے کا جواز تخلیقی سطح پر بھی فراہم ہوا ہے۔ زیاں کا کوئی احساس نہیں۔ یہ تعمیری سوچ کا ایک رُخ ہے جو بیان ہوا ہے۔

''واپسی'' بھی انتقالِ آبادی سے پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کرتا ہے مگر واضح امید کے ساتھ کہ انسانیت ابھی زندہ ہے۔

''آئینے کا آدمی'' مغربی معاشرت کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی ہے جو وہاں اپنی اپنی دنیا بسانے اور بچوں کو نظر انداز کرنے سے برآمد ہونے والے المیے کو بیان کرتی ہے، بالکل وہاں کا ماحول اور جینے کا ڈھنگ تمام جزئیات کے ساتھ رقم ہوا ہے۔ یہ حسّانہ کی تیز نگاہوں کا کمال ہے، محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مصنفہ وہاں کی رہنے والی نہیں ہیں۔

''جب آنکھ کھلی گل کی'' میں ایسی باریک جزئیات نگاری ہے جو آج کل ناپید ہے اور فکشن تو یہ بھرپور ہے کہ سارے اجزا اپنی جگہ نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسّانہ انیس نے کھلی آنکھوں سے بھرپور زندگی کا مشاہدہ کیا اور فن کی رفعتوں سے بھی ہم کنار ہوئیں۔ کاش وہ ہمارے درمیان تادیر ہوتیں!!

☆☆☆

طوفان میں ٹھہرا ہوا لمحہ

ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے کنارے وسیع وعریض شہر کے اس فلک بوس فلیٹ کی چھٹی منزل پر پہنچ کر جوں ہی وہ لفٹ سے باہر آیا تو اس کے سامنے جس فلیٹ کا دروازہ کھلا تھا اس میں بکھرے بالوں کے درمیان اُسے وہ چہرہ نظر آیا جس نے اس کے تیز رفتار قدموں کو یوں روک دیا جیسے بجلی بند ہو جانے سے اچانک لفٹ رک جائے۔

وہ فلیٹ نمبر سکس۔ایچ کی بجائے فائیو ایچ کے کھلے دروازے کے سامنے خواب کی سی کیفیت میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔وہ جس کے سوا پوری دنیا اس کے لیے ویران ہو چکی تھی۔ جس کے بغیر جوانی کی منزلیں اس نے بے سمت ہی طے کر ڈالی تھیں۔تنہائی اور محرومی کا زہر نشہ بن کر اس کی رگوں میں یوں سرایت کر گیا تھا کہ جس کی ترنگ میں آوارہ بادلوں کی طرح وہ آسمان کی وسعتوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔موسم بہار میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح

زمین پر رُلتے رُلتے وہ اپنی تازگی اور رنگت کھو بیٹھا تھا۔ محبتوں کے سارے رشتے ٹوٹ کر بکھر چکے تھے۔ ایک وہ تھی کہ گم ہو کر بھی خوشبو کی طرح اس کے وجود میں بس رہی تھی۔ درد کی چبھن کی طرح خلوت وجلوت میں اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہی تھی۔ کتنا سفر گزر گیا، کتنا فاصلہ طے ہوا اسے کچھ بھی خبر نہ تھی۔ وہ تو درماندگی میں اپنے زخمی تلوؤں سے کانٹے چننے کے لیے بھی کہیں نہ رکا تھا۔ راستے میں جا بجا ٹھنڈی چھاؤں نے اسے آواز دی۔ مہربان چہروں نے کئی بار منزل کی طرف رہنمائی کے لیے ہاتھ بڑھائے لیکن پیاسا ہونے کے باوجود وہ ظلمات میں اس چشمے کے لیے بھٹکتا رہا جس کے چند قطروں نے اسے جنم جنم کا پیاسا بنا دیا تھا۔ کچھ یوں لگتا تھا اُسے جیسے صدیاں بیت گئیں۔ وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح کہاں کہاں نہ بھٹکا۔ گزرتے سمے نے نہ جانے کب اور کیسے علم کے تجربے اور عہدوں کے سکے اس کی جھولی میں ڈال دیے لیکن وہ آنکھیں بند کیے اپنی تنہائیوں اور محرومیوں کی ردائے تار تار میں لپٹا دور کہیں پڑا تھا۔ اپنے مادی وجود سے الگ کبھی کبھی جب وہ اپنی ردائے بوسیدہ کے روزنوں سے اپنے باہر کے وجود کو دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ وہ تو کوئی اور تھا جس نے مال بھی کمایا اور نام بھی۔ لیکن اندر تو وہی تشنگی تھی اور وہی محرومی۔ ردا سے باہر والے وجود کے ہاتھ میں بھرا ہوا کشکول تھا اور اندر والا وجود خالی، تہی دست اور تہی دامن!

اور اب اپنی نظروں کے سامنے فلیٹ کے کھلے ہوئے دروازے میں وہ خواب اسے پھر نظر آ رہا تھا۔ وہ خواب، وہ سراب جسے اُس نے اپنی صحرانوردی کے دوران کئی بار دیکھا تھا۔ پُر ہجوم بازاروں میں چہکتی مہکتی پارٹیوں میں، شاپنگ آرکیڈز میں، اسٹیشن اور ایئرپورٹ کے ازدحام میں، سوتے جاگتے نہ جانے کتنی بار دیکھا اور ہر بار دوڑتے بھاگتے یہ منظر نظروں سے اوجھل ہو گئے جس کے بعد آندھیوں اور بگولوں کے سوا اسے کچھ نہ ملا۔ وہ اتنی بار اس عذاب سے گزرا تھا کہ سامنے نظر آنے والے اس وجود کو وہ خوف اور بے یقینی سے دیکھ رہا تھا کہ کب یہ خواب حقیقت سے ٹکرائے اور چکنا چور ہو کر ایک بار پھر اس کے وجود میں تنہائی کا مزید زہر

انڈیل دے۔

وہ بستر پر خاموش بیٹھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس کی وہ لٹیں پھسل کر اس کے چہرے پر چھا گئی تھیں جنہیں وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنی چار انگلیوں سے سمیٹ کر پیچھے کر دینے کی عادی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے دونوں ہاتھ اس کی گود میں پڑے تھے اور سیاہ بالوں کے ہالے میں اس کا چہرہ خوفناک حد تک زرد تھا۔ باہر اور اندر کچھ عورتیں کھڑی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ وہ جیسے خواب اور حقیقت کی اس درمیانی کیفیت میں تیرتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اس نے چونک کر اپنی جھکی ہوئی پلکیں اوپر اٹھائیں اور ایک دم سے کھڑی ہوگئی۔ دوسرے لمحے وہ دوڑ کر اس کی طرف جھپٹی اور پھر اس کے سینے سے لگ گئی۔ اس خواب نما حقیقت کا ہر لمحہ ایک سنسنی خیز دھڑکن بن کر اس کے وجود میں اترتا جارہا تھا۔ اپنے خون کی گردش کی دھمک اسے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جس کی آواز نے اس کے دل کی دھڑکنوں میں بچھڑی رتوں کے ایک ایک احساس کو زندہ کر دیا تھا۔ اس کا اپنا گھر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا جس کے مختلف گوشوں سے ابھر ابھر کر مختلف تصویریں اس کے سامنے آرہی تھیں۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ناچتے تھرکتے، پتنگ اڑاتے ہوئے اس کے بال پھاگن کی ہواؤں میں پیچھے پیچھے اڑتے جاتے اور وہ اس کی چرخی سنبھالے، اس کی اڑتی ہوئی پتنگ پر نظریں جمائے اس کے پیچھے پیچھے ہوتی۔ زندگی کے کئی خوبصورت موسم ڈور، پتنگ، چرخی، کھلی ہوا اور چمکیلی دھوپ، تمتماتے چہرے اور بکھرے بالوں کی نرمی میں آسمان پر ہلکے ہلکے تیرنے والے بادلوں کی طرح گزر گئے۔ اور پھر جب اس نے ڈور لپیٹی تو آسمان بہت دور نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ سورج بہت تیزی سے چمکنے لگا تھا اور گرم زمین اس کے کومل پیروں کو اس طرح جھلسا رہی تھی کہ وہ بے قرار ہو کر بار بار اپنی جگہ بدل رہی تھی۔ یہ سب کچھ اس کے لیے سوہان روح تھا سو اس نے اسے اپنے شانوں پر اٹھا

لینے کا عزم کر لیا۔

اور پھر ایک دم سے ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ بہار کی بارش کے چھینٹوں نے گرم زمین کو ٹھنڈا کر دیا۔ نیلے آسمان پر دھنکی ہوئی روئی بکھر گئی۔ اس کا کمہلایا ہوا چہرہ کھل اٹھا اور وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پھولوں بھری وادی کی سمت چل پڑے۔ وہ تعلیم سے فارغ ہو چلا تھا۔ ان دونوں کی پتنگ ہوا کے دوش پر بہت دور آسمان کی نیلاہٹوں میں ایک نقطہ بن گئی تھی اور وہ دونوں ڈور اور چرخی تھامے اس پر نظریں مرکوز کیے بسنت رُت کا ایک جزو بن گئے تھے۔ ہر طرف سکون اور خاموشی تھی۔ خوشگوار دھوپ سے دونوں کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ آسودگی اور اطمینان کی اسی کیفیت میں اچانک طوفانی ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں۔ یہ طوفان سیّدوں کی برادری کی طرف سے اٹھا تھا اور ایک کمزور سی، بے سہارا لڑکی جس کا دور دور تک کوئی اپنا نہیں تھا یک لخت سیّدوں کی نفرت و آبرو کا مسئلہ بن گئی تھی۔ کسی سید لڑکی کا کسی غیر سید سے کیا تعلق بن سکتا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ پوری سید برادری کی آبرو کے محافظ ایک پیر صاحب کہیں سے نمودار ہو گئے جو ملک کے کسی دور افتادہ گاؤں کی کسی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے اور تبلیغی دورہ کرتے ہوئے وہاں آ پہنچے تھے۔ سیدوں نے غیبی امداد سمجھ کر ان کی پذیرائی کی۔ یہ جانے بغیر کہ پیر صاحب کا ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ پردۂ اخفا میں تھا۔ انہیں تو ایک بے سہارا بیوہ ماں کی نوجوان بیٹی کو شرف زوجیت عطا کر کے ثواب دارین حاصل کرنا تھا سو انہوں نے سید برادری کی آبرو فرشتۂ رحمت بن کر بچائی اور ایک بیوہ ماں کو اپنے زیر بار احسان کر کے سید زادی کو بیاہ کر لے گئے۔

اس طوفان نے اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی پتنگ کی ڈور یوں توڑ دی کہ ڈور کی کاٹ کا زخم پورے وجود کو زخمی کر گیا جس کے درد کی ٹیسیں لیے نہ جانے وہ کب سے کہاں کہاں بھٹکتا پھر رہا ہے۔ ہر موڑ پر اسے وہ اپنے چہرے کی جھلکیاں دکھاتی ہے اور اسے اپنی

تلاش پر مجبور کرتی ہے اور وہ اپنے اندر اور باہر کے وجود کا طویل سفر طے کر کے خود کو واپس وہیں کھڑا ہوا پاتا ہے۔

اور اس وقت ایک اجنبی دیس میں ایک انجانے سے گھر میں وہ اس کے سامنے یوں اچانک آ گئی اور یوں اس کے سینے سے لگ کر روئے جا رہی تھی اور وہ ایک خواب ناک سرشاری کے عالم میں کھڑا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کی رگوں میں دوڑتے خون میں شامل ہو کر اس کے رگ و ریشے میں اترتی چلی جا رہی ہو۔ وہ اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا کہ وہ ایک دم سے الگ ہوگئی اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے نحیف آواز میں بولی۔

''تمہیں اس کی اطلاع کس نے دی؟''

اس نے پلٹ کر انگلیوں کی سمت دیکھا اور پلنگ پر ایک ڈھیر کی صورت میں جو کچھ اسے نظر آیا اُس نے اُس کے ابلتے ہوئے خون کو منجمد کر دیا۔ یہ اس کے بچے کی لاش تھی۔ تب ہی اس کی زندگی کے باقی ماندہ گم شدہ اوراق تلخ حقیقت بن کر اُس کے سامنے آ گئے۔

پیر صاحب جو ملکوں ملکوں گھومتے اور تبلیغ کیا کرتے تھے بعض اوقات کسی یتیم اور بے سہارا لڑکی کو غیر کفو میں جانے سے بچانے کے لیے اسے اپنے حلقۂ ازدواج میں بھی شامل کر لیا کرتے تھے۔ وہ پیر صاحب کی عنایت سے ان کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں بندھی تھی اور پھر پیر صاحب تبلیغی دورے پر امریکہ چلے گئے تھے۔ یہ بچّہ کب پیدا ہوا، کیسے پلا اور بغیر دوا اور غذا کے کب تک بیمار رہا کچھ معلوم نہیں۔ آج صبح وہ چل بسا۔ پیر صاحب کی مقدس مصروفیات میں یہ سب کچھ جاننے کی گنجائش نہیں تھی۔ معلوم نہیں وہ کس ملک کے کس شہر میں ہوں گے۔ رہا بچہ تو وہ اللہ ہی کی طرف سے آیا تھا اور اسی کی طرف لوٹ گیا۔

اس نے فلیٹ کے اندر کی بے سروسامانی پر ایک نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے ہر چیز فروخت ہو چکی ہے۔ اور اب پیر صاحب کے آخری تحفے کو اس

کی ابدی آرام گاہ تک پہنچانے کا فریضہ اسے انجام دینا تھا جو یوں اچانک آ پہنچا تھا۔ یہ فریضہ اس نے کس طرح انجام دیا یہ اسے معلوم نہیں۔ اس کے ذہن پر تو غم سے بوجھل دو محزون آنکھیں طاری تھیں جن میں محبت کا واسطہ ہی نہیں ایک خاموش التجا بھی تھی۔ اور پھر جب وہ اس کا چھوٹا سا سوٹ کیس سنبھالے اسے اپنے ساتھ لے کر فلیٹوں کے اس گھنے جنگل سے نکلا تو بپھرا ہوا سمندر پُر سکون اور گہرا نیلا تھا۔ تیسرے پہر کی دھوپ سائے کی طرح موجوں پر لہرا کر دھوپ چھاؤں کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ سمندری بگلے سمندر کی سطح پر جھپٹ جھپٹ کر چھینٹیں اڑا رہے تھے۔ ان کے سفید پروں کو دیکھ کر امن اور شانتی کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ساحل کے قریب ایک پارک میں آ بیٹھے۔ اس کے چہرے پر بکھری لٹیں جنہیں اس کی انگلیاں ہٹانا بھول چکی تھیں، سمندر کی بھیگی ہوا انہیں سنوارنے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی۔ اس کے خشک ہونٹوں کے اندر بند نہ جانے کب کی گھٹی ہوئی ایک سانس جیسے خود بخود آزاد ہوئی۔ سامنے سمندر کی لہریں ساحل کو تھپک تھپک کر واپس جا رہی تھیں۔ ناریل کے جھنڈ ہوا سے جھوم رہے تھے۔ سمندر کی ہوا ان کے جسموں کو نم کر رہی تھی اور پیروں کے نیچے گیلی ریت کی ٹھنڈک تمام جسم میں راحت کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ لہروں سے جذب ہونے والا پانی ریت میں ننھے ننھے بلبلے بنا رہا تھا۔ جس سے اُن کے پیروں میں ہلکی ہلکی گدگدی سی ہو رہی تھی۔

وہ دونوں پاس پاس بیٹھے تھے۔ اُس نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ منزل پر پہنچنے والے کسی درماندہ مسافر کی طرح نڈھال ہو کر آسودگی کے احساس کے تحت بے اختیار اس کے شانے سے لگ گئی۔ وقت پچھلے پاؤں چلتے ہوئے پھر وہیں پہنچ گیا جہاں سے ان دونوں نے اپنا سفر ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ گزرا ہوا قیمتی لمحہ یادوں کی لہروں سے سیراب ہو کر بلبلے کی طرح ابھر رہا تھا جس نے ان کے اندر ہلچل سی برپا کر دی تھی۔ دل کے اسکرین پر ان گنت یادیں نمودار ہو کر ایک دوسری میں جذب ہو رہی تھی۔ ہر جذبہ احساس کے

تاروں سے جڑ کر دل کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ آسودگی اور سکون کی نرم رو لہریں انہیں تھپک رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آدم و حوا کی گمشدہ جنت انہیں مل گئی تھی۔ عتاب و عذاب ختم ہو چکا تھا۔ اور اب کرم ہی کرم تھا۔

پارک میں اب بھیڑ ہو رہی تھی۔ ہر عمر کے جوڑے، عورتیں اور بچے، کھیل کود اور باتوں کی آوازیں، قہقہے، نغمے، رنگا رنگ لباس، ان کے پیچھے مائیں بچوں کی پرام لگا کر باتوں میں مصروف تھیں۔ لیکن وہ دونوں اس ہنگامے سے بے نیاز ایک دوسرے کے قریب اور تنہا تھے۔ اس تصور سے سرشار کہ اس شام کے بعد اگلے دن کا سورج کیسا تابناک اور روشن ہوگا۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی اور سمندر کی لہریں اب ان کے پیروں کو چھو چھو کر گزر رہی تھیں کہ اچانک کسی بچے کے رونے کی آواز آئی اور اسی آواز کے ساتھ ہی یک لخت وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں جو ابھی ابھی زندگی کی رمق سے آشنا ہوئی تھیں اور کمہلائے ہوئے چہرے پر آس کی جھلک نمودار ہوئی تھی۔ یکا یک یوں بجھ گئیں جیسے بجلی چمکی اور پھر سارا ماحول تاریکی میں ڈوب گیا ہو۔

''سنو تم نے اس کی قبر پر پانی تو چھڑک دیا تھا نا؟'' وہ عجیب سے سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک سمت چل پڑی۔ اس نے اسے آواز دی تو وہ اس کی طرف پلٹی۔ اس کا چہرہ سخت اور زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں حزن کے ساتھ اب وحشت اور بے گانگی بھی سمٹ آئی تھی۔

وہ رک رک کر اس سے اپنے شہر جانے والی ٹرین کی روانگی کا وقت پوچھ رہی تھی۔ اس سے ایک ٹکٹ لا کر دینے کی درخواست کر رہی تھی اور شاید رسمی شکریے کے مخصوص الفاظ ادا کر رہی تھی اور وہ چپ کھڑا تھا۔ اس کا لہجہ اور اس کے الفاظ میں اتنی اجنبیت تھی کہ اسے ان پر بازگشت کا گمان ہو رہا تھا۔ روانگی کی تیاریوں کے دوران وہ اس طرح اس کے ساتھ تھی کہ تمام

وقت وہ اس کے وجود کی قربت کی سرشاری میں گم رہا۔ یوں جیسے اب وہ ہمیشہ ساتھ چلتے رہیں گے۔

ٹرین کے روانہ ہونے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی جیب میں دو ٹکٹ تھے اور الفاظ آتش فشاں کی طرح اس کے سینے میں مچل رہے تھے لیکن اس کا رویہ برف کی طرح سرد تھا جس نے اس کی زبان بند کر رکھی تھی۔ اسٹیشن کے شوروغل کے اندر وہ دونوں سناٹے کے حصار میں گم سم بیٹھے تھے۔ اُس نے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے تھے جن کی سفیدی پر ابھری ہوئی نیلی رگیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اور وہ خاموشی سے اپنے ناخن کریدنے لگی۔ ٹرین کی مدھم روشنی میں اس کی پلکوں کا سایہ بہت دور تک اس کے رخسار پر پڑ رہا تھا اور بالوں میں گھرا ہوا اس کا چہرہ زیادہ زرد اور نحیف نظر آ رہا تھا۔

وہ اسے یہ بتانے کے لیے بے قرار تھا کہ وہ خوفناک جنگل جس کے اندھیرے میں وہ بھٹک رہے تھے ختم ہو چکا ہے۔ سامنے ایک روشن اور چمکیلی شاہراہ ہے جس کے دونوں طرف کھلی ہوا اور سرسوں کے لہلہاتے کھیت ہیں۔ درختوں پر دور دور تک رنگا رنگ پھول کھلے ہیں جن کے اوپر شہد کی مکھیاں گنگنا رہی ہیں۔ نیلے آسمان پر بادل سبک خرامی سے گزر رہے ہیں۔ خوبصورت تتلیاں فضا میں محوِ پرواز ہیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ جانے کیا کیا سوچے جا رہی تھی۔ آخر کار اس نے بڑی بے صبری سے اسے شانے سے ہلایا اور وہ خوش گوار منظر دیکھنے کی التجا کی جو وہ خود دیکھ رہا تھا۔

اس نے بڑے وقار سے اپنی نظریں اٹھائیں اور نظریں چار ہوتے ہی اس کے چہرے کا رنگ ایک دم سے بدل گیا۔ اندھیرا آسمان ایک دم سے روشن ہو گیا۔ اس نے ایک سرشاری کے عالم میں اس کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں ٹکٹ نئی منزل کے پروانۂ راہداری کے طور پر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ اس نے حیرت سے ٹکٹوں کو دیکھا۔ ایک ٹکٹ اپنے پرس میں رکھا

اور دوسرا واپس اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ پھر اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے مضبوط لہجے میں رک رک کر بولی۔

''تم جانتے ہو کہ میں سیّدزادی ہوں اور سیّدوں کو خیرات نہیں دی جاتی۔''

ساتھ ہی بڑی آہستگی سے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے علیحدہ کرلیا۔ جذبات کی تمام جوت اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر اُس نے نظریں جھکا لیں۔ اسی وقت ٹرین نے وِسل دی اور وِسل کی چیخ کے ساتھ ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے رینگتی ہوئی رات کے اندھیرے میں ڈوب گئی اور اس کی عقبی سرخ روشنی دودہکتے ہوئے انگاروں کی طرح اس کی آنکھوں میں اتر گئی۔ وہ اس اجنبی شہر کے پُر ہجوم اسٹیشن پر تنہا اس روشنی پر نظریں گاڑے کھڑا رہا۔ اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ اس عالم میں گھڑیاں گزر گئیں کہ صدیاں یا پھر طوفان میں ٹھہرا ہوا ایک لمحہ!

☆☆☆

نائٹ میئر

''رات اس نے پھر ہماری نیند حرام کی۔'' ناشتے کی میز پر امی نے اپنی مخصوص بیزاری سے اعلان کیا۔ اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ اب وہ سارے گھر کی ملامتی نظروں کا ہدف ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بڑے بھیا اس کے نفسیاتی تجزیے کی بات کریں گے۔ باجی دعائیں پڑھے بغیر سونے پر ملامت کریں گی۔ چھوٹی بہن اپنا بستر الگ کر لینے کی دھمکی دے گی۔ چھوٹا بھائی اس کا مذاق اڑائے گا اور پھر ابا اس کے زرد و سہمے ہوئے چہرے کو دیکھ کر فکرمند اور دکھی ہو جائیں گے، سب کو ڈانٹ کر خاموش کریں گے۔ اس کے گال تھپتھپا کر اسے پیار کریں گے لیکن وہ کئی دن تک پریشان رہے گی۔ یہ خواب دن بھر اس پر ایک عذاب کی طرح مسلط رہے گا۔ اسکول کی کارکردگی سے لے کر گھر کے کاموں تک بار بار اسے اپنی غفلت پر پھٹکار سننی پڑے گی اور رات کو پھر اسے خواب آور گولی کھلائی جائے گی۔ لیکن

خواب کا اثر ہفتوں میں کہیں جا کر زائل ہوگا۔ خوف اس کے دل سے نکلے گا اور وہ نارمل طریقے سے کام کرے گی۔ استانیوں کی ماہانہ رپورٹ تسلی بخش ہوگی اور تب وہ سب سے مل جل کر ہنسنا بولنا شروع کرے گی۔ لیکن پھر کسی دن وہی منحوس خواب نظر آئے گا اور وہی سب کچھ پھر دہرایا جائے گا۔

اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اس خوفناک خواب کا سلسلہ اُن دنوں سے شروع ہوا تھا جب اس نے لکھائی شروع کی تھی۔ اس کی ہینڈ رائٹنگ ہمیشہ سے خراب تھی، اس کی سہیلیاں اور گھر والے ہمیشہ اس کے حروف کا مذاق اڑاتے تھے۔ چھوٹا بھائی کہا کرتا تھا کہ تمہارے ج، چ، ح، خ دُم کٹی بطخ ہوتے ہیں۔ ص، ض، ف، ق، زنجیر کی کھلی ہوئی کڑیاں ہوتے ہیں۔ م، ق، ف اور 'و' کی آنکھیں پھوٹی ہوئی ہوتی ہیں 'ل' کی شکل ٹوٹے ہوئے چمچے اور 'ی' کی شکل پچکی ہوئی ہانڈی کی سی ہوتی ہے اور 'لا' تو بالکل چمٹا سا ہوتا ہے۔ اسی طرح انگریزی ہینڈ رائٹنگ میں تمہارے R,A,N,M اور K لنگڑے اور I,J کبڑے اور Q,O سکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے قلم سے لکھے جانے والے حروف کی تضحیک نے اسے اور بھی لاپروا بنا دیا تھا اور اردو اور انگریزی دونوں ہی کے حروف بننے کی بجائے بگڑتے جا رہے تھے۔ ہر کلاس میں اپنی ہینڈ رائٹنگ پر اسے لعن طعن سننی پڑتی تھی اور وہ خاموشی سے صرف ٹیچر کا منہ تکا کرتی تھی۔ ہر ماہانہ اور دوسری رپورٹوں میں اس کی بدخطی کی شکایت گھر والوں تک پہنچتی اور ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود اس کے حروف کی شکلیں بگڑتی جا رہی تھیں ہر تنبیہہ پر وہ خاموش رہتی جسے اس کی ڈھٹائی پر محمول کیا جاتا۔

اور پھر ایک دن اس کی ٹیچر کے غصے کا پارہ ایسا چڑھا کہ انہوں نے اس کی کاپیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور دوسرے دن ٹیلی فون کر کے اس کی امی کو اسکول میں بلوا لیا ٹیچر نے اس ہینڈ رائٹنگ کی خرابی کا سبب والدین کی لاپرواہی کو قرار دیا اور خوب جلی کٹی سنائیں۔ ماں جو پہلے ہی اس کی بدخطی کی اصلاح کرتے کرتے تنگ آ چکی تھیں اسکول میں ٹیچر کے ہاتھوں اپنی توہین پر غصے میں آپے سے باہر ہوگئیں۔ اسکول سے واپس آتے ہی اس کی

کاپیاں برآمد کیں اور چیتھڑا کاپیوں کو دیکھ کرایسی آگ بگولا ہوئیں کہ سر سے پیر تک اسے روئی کی طرح دھنک کرڈال دیا۔ وہ تو بھائی جان آڑے آگئے ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ ماں کے ہاتھوں پہلی بار وہ پٹی اور اتنا پٹی کہ رو رو کر ہلکان ہوگئی۔ اس حادثے پر گھر کے تمام افراد متاثر ہوئے۔ سب نے اس کی دلجوئی کی اور وہ چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹی سسکتی رہی۔ ابا نے بہت پیار کیا۔ کھانا کھلایا، بازار لے گئے اور اس کا پسندیدہ کلر باکس دلایا۔ لیکن وہ غم سے نڈھال رہی۔ ہر شے اسے اداس اور بے معنی سی لگ رہی تھی۔ اپنی ننھی سی جان پر تشدد اسے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ بار بار اس کی آنکھیں بھر آتیں ہچکیوں اور سسکیوں کے دوران اس کی آنکھ لگ گئی

نیند میں بھی اپنی کاپی، ان میں لکھے گئے بدہیئت حروف اور امی کی مار اس کے ذہن پر طاری رہی اور پھر کسی قسم کی ہلچل سے اس کی نیند ٹوٹ گئی یا شاید اس نے خواب دیکھا کہ اس کے سرہانے رکھے شیلف سے اس کی کاپیاں اڑ اڑ کر اس کے بستر پر گر رہی ہیں اور ان میں سے حروف کے پرے کے پرے نکل نکل کر اس کے چاروں طرف جمع ہو رہے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ یہ حروف اسی کے لکھے ہوئے تھے۔ ٹیڑھے میڑھے حروف سخت خوفناک اور غضب آلود ہو رہے تھے۔

''مارو، مارو''

''ٹانگیں توڑ دو''

''آنکھیں پھوڑ دو''

''کبڑا بنا دو، ٹکڑے کر دو''

سارے حروف چیختے چنگھاڑتے، نعرے لگاتے اس پر یلغار کے لیے بڑھ رہے تھے اس نے بھاگنا چاہا تو لنگڑے M,K,A اور N نے اسے گھیر کر اڑنگا لگایا اور وہ گر گئی۔ اس وقت ٹیڑھے T نے اس پر اپنا ہتھوڑا برسانا شروع کر دیا اور I نے اپنا نیزہ لے کر اس کی آنکھیں پھوڑنے کی کوشش کی۔ 'ع' اور 'غ' نے اپنی چونچوں سے اس کی پنڈلی کا گوشت نوچنا

شروع کر دیا اور وہ بے تحاشا چیخنے لگی اور جب امی اور ابا کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں تو سب کے سب حروف اسے اپنے اوپر سوار ہوتے نظر آ رہے تھے اور اس کی چیخیں تھیں کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ پھر نہ جانے کیا ہوا اور جب اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال کے بیڈ پر تھی اور بیڈ نمبر 9 کا سرخ ہندسہ چمک رہا تھا۔ امی سجدے میں تھیں اور ابا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ وہ ایک دن اور ایک رات بے ہوش رہی تھی۔ اس کے بعد وہ کچھ لکھتی اسے بنا سنوار کر خوش خط لکھتی اور پھر یوں ہوا کہ اس کی ٹیچرز اس کی تحریر کو موتیوں کی جڑائی سے تشبیہ دیتیں۔

لیکن خوابوں نے پھر بھی اس کی پیچھا نہیں چھوڑا۔ دو چار مہینوں میں یہ ڈراؤنا خواب پھر نظر آ جاتا۔ اور وہ دن گھر سے اسکول تک ضائع ہو جاتا۔ وہی خوف، طنز، ڈانٹ ڈپٹ اور مذاق۔ اس خواب کے اثر سے کئی کئی دن وہ شدید ڈپریشن کی زد میں رہتی۔ پھر وہی ہنسنا بولنا۔ دوڑ دھوپ، مقابلہ، کامیابی، ناکامی بہت سے دن یوں ہی گزر گئے۔

اسکول سے کالج تک آتے آتے بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ کالج میں کلاسوں اور سہیلیوں کے درمیان زندگی بہار کی ہوا کی طرح گزری۔ رنگوں اور خوشبوؤں کے ہجوم میں اور پھر اسی بے خودی کے عالم میں اس کا ہاتھ مسعود کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور زندگی کے سفر کا یہ مرحلہ اس نے پھولوں سے بھری وادی سے شروع کیا۔ جہاں رنگا رنگ تتلیاں ہر طرف منڈلاتیں اور شہد کی مکھیاں گنگناتیں۔ گہرے نیلے آسمان پر روئی کے گالے سے تیرتے، درختوں پر چڑیاں چہچہاتیں۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ پھولوں کے درمیان چلتی یا اڑتی رہی۔ نکہت و نغمہ، رنگ و نور کے ہجوم میں وہ سب کچھ بھولی رہی۔

پھر نہ جانے کب اسے اپنے تلوؤں میں چبھن محسوس ہوئی اور تب اسے وہ کانٹے نظر آئے جو اب تک پھولوں کے جھنڈ میں پوشیدہ تھے اور جن کے درمیان سے وہ راستہ بناتے ہوئے گزر رہی تھی۔ اور تب اسے محسوس ہوا کہ راستہ بناتے بناتے اس کے ہاتھ اور پیر دونوں زخمی ہو گئے تھے۔ پھولوں بھری وادیاں اور گل پوش راہیں دور کہیں بہت پیچھے چھوٹ گئی تھیں۔

اور پھر اسے اپنے کانٹوں سے تار تار دامن اور پتھروں سے کچلے ہوئے تلوؤں کے ساتھ اپنا بوجھ اٹھائے آگے ہی آگے چلنا تھا۔ کانٹوں نے تلوؤں میں کتنے زخم لگائے اور کتنا خون بہایا۔ اس کا حساب کرنے کا اسے ہوش ہی کہاں تھا۔ اس کا شریکِ سفر بہت دور تک اسے ٹھوکر کھا کر گرنے سے بچاتا رہا اور منزل کی نشاندہی بھی کرتا رہا۔ لیکن نہ جانے کس منزل پر ٹھوکریں کھا کر گرتے ہوئے اس نے جو اپنے آگے دیکھا تو ہم سفر اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اس کا سفر ختم ہو چکا تھا۔ اور اب یہ تلخ حقیقت اس کے سامنے تھی کہ اب اسے تنہا ہی اپنا بوجھ بھی اٹھانا ہے، راستہ بھی بنانا ہے اور اس منزل تک پہنچنا ہے جہاں اس کے بچوں کے لیے عظمتیں اور راحتیں انتظار کر رہی ہیں۔

راستے میں کتنے ہی سایہ دار درختوں اور مخملیں سبزہ زاروں نے اس کا راستہ روکا کہ آگے کھائیاں اور گھاٹیاں تھیں اور پُر خطر اندھیرے غاروں سے ہو کر گزرنا تھا۔ لیکن پھولی ہوئی سانسوں اور زخمی جسم کا بوجھ اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے اپنے دشوار گزار سفر پر آگے بڑھتی رہی۔ اسے اپنے بچوں کا روشن اور چمکدار مستقبل جس کی اسے تلاش تھی بہت دور بلندیوں پر چمکتا نظر آ رہا تھا۔ اور اسے بہر حال وہاں پہنچنا تھا۔ اندھیرے غاروں سے گزرتے ہوئے وہ سردی اور خوف سے کانپ کانپ گئی اور پھر اس سے نکل کر تیز دھوپ میں تپتے پتھروں پر جھلستے پیروں سے گزرنا پڑا۔ راستہ مشکل تھا مگر طے ہوتا رہا، بلندی قریب آتی گئی۔ وہاں تک پہنچنے کی دھن میں اسے اپنے تن بدن کا ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ پیچھے مڑ کر یہ دیکھتی کہ اس کے پیچھے اس کے خون کی ایک لکیر ایک مسلسل پگڈنڈی بناتی ساتھ ساتھ چل رہی ہے اس کی نظر سامنے تھی جہاں اس کے بچوں کا روشن مستقبل چمک رہا تھا۔ اسے اپنی سدھ بدھ ہی کہاں تھی کہ وہ اپنے تار تار ہوتے وجود کی خبر لیتی۔ اور جب کبھی دُکھن کا احساس ہوتا تو وہ زخموں کا جائزہ لینے کی بجائے فاصلوں کا حساب کرتی کہ بس منزل اب قریب ہے۔

اور آخر کار کسی نہ کسی طرح وہ اس مسطح بلندی پر پہنچ گئی پھولتی ہوئی سانسوں، زخمی ٹانگوں اور اپنے دُکھتے ہوئے وجود کو اس نے خود بخود وہاں گرا دیا۔ منزلِ مقصود اس کی دسترس

میں تھی۔ تھکن سے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو جاتیں۔ وہ نیم بے ہوش سی ہو جاتی۔ اس احساس سے کہ اب اسے آرام کرنا ہے اور اس نے اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کر دیا ہے۔

لیکن لیٹے لیٹے ہی وہ اپنے اردگرد اپنے بڑے ہوتے ہوئے آسودہ بچوں کو دیکھ کر چونک جاتی۔ ابھی تو اسے بہت کام ہیں۔ ابھی تو وہ منزلیں بھی طے کرنی ہیں اور ان کو اور محفوظ بلندیوں تک پہنچانا ہے۔ پھر نئے سرے سے اپنے تار تار وجود کو سمیٹتی، پتھروں کے درمیان راستہ بناتی وہ اس سمت چل پڑی جہاں اس سے پہلے کسی کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ ایک خوش گوار اور محفوظ ترین مستقر کی تلاش میں وہ کئی دشوار گزار وادیاں طے کر گئی۔ اس تھکن اور زخم خوردگی میں اسے اپنے پیچھے آنے والوں کے نوجوان اور تابناک چہرے بھی دھندلے نظر آنے لگتے مگر وہ ان چہروں کو اور بھی نکھارتی، انہیں مزید طاقتور بنانے کی دھن میں اگلی منزل کی جانب چل پڑتی۔ اپنے احتجاج کرتے زخموں کو چارہ سازی کا دلاسا دیتی ہوئی وہ گھسٹتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔

آخر کار وہ منزل مقصود پر پہنچ ہی گئی اور ایک فخریہ آسودگی سے اس نے اپنے جوان بچوں کو دیکھا۔ ایک سے ایک بہتر۔ سب کامیاب اور خوشحال، قابلِ رشک اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے راستے کو دیکھا جس سے گزرتے ہوئے وہ کن کن اذیتوں اور عذابوں سے گزری۔ سب کچھ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے راستے کی طرف اپنی پشت کر لی اور اپنا چہرہ ان چہروں کی طرف موڑ لیا جو اس کی زندگی بھر کی ریاضتوں اور کاوشوں کا ماحصل تھے۔ اس کے شانوں پر اب کوئی بوجھ نہ تھا۔ اس کے تلوؤں میں اب کوئی ٹیس نہ تھی۔ دور دور تک پتھروں اور کانٹوں کا نام ونشان بھی نہ تھا جنہوں نے اس کے وجود کو تار تار کر دیا تھا۔ اب نہ تپتی جھلستی زمین تھی اور نہ شعلہ بار آسمان اور نہ رگوں میں خون کو منجمد کر دینے والی گھپائیں۔ اس نے اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں پر رشک آمیز مبارکبادیاں اور شاباشیاں وصول کیں اور مسرور ہو گئی۔

لیکن اس منزل پر پہنچ کر اسے حبس اور گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ نہ جانے کیوں فضا گرم سی ہونے لگی۔ یہ سب کچھ اس وقت محسوس ہوا جب اس نے ستائشی اور گہری نظروں سے

اپنے بچوں کی طرف دیکھا اور اپنے چہرے پر اسے لُو کے تھپیڑوں کے ٹکرانے کا احساس ہوا۔ اس وقت پہلی بار اسے اپنے پیروں کے نیچے لرزش سی محسوس ہوئی جب بہت سے شکایتی حروف ان کے چہروں پر کیچوؤں کی طرح کلبلاتے نظر آئے۔

اس نے اپنے بچوں کے چہروں پر پھیلے ہوئے شکایتی حروف کو پڑھنے کی کوشش کی۔ دونوں چھوٹوں کو اپنی تعلیم کی غلط Planning کا شکوہ تھا۔ بڑے کو یہ شکایت تھی کہ اسے تعلیم کی بجائے بزنس میں دھکیل دیا گیا۔ لڑکی اپنی پسند کا رشتہ نہ ہونے پر خفا تھی۔ ان سب کے چہروں پر غضبناک حروف سانپوں کی طرح بل کھاتے، پھنکارتے نظر آئے اسے محسوس ہوا کہ یہ حروف شکایت، یہ بل کھاتے سانپ اس پر حملہ آور ہورہے ہیں۔ پھر وہ ہمت کر کے دوبارہ ان کے چہروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی۔ Latest فرنیچر سے سجا ہوا ڈرائنگ روم اپنے مکینوں سمیت مہیب سناٹے میں گم تھا اور پلیٹوں پر چمچوں کی کھٹا کٹ اس کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح پڑ رہی تھی۔ دُزدیدہ نظروں سے اس نے ایک ایک جھکے ہوئے سر کو دیکھا اور سوچ میں ڈوب گئی۔ کیا یہ وہی اس کے جگر گوشے تھے جو ہمیشہ کھانے کی میز پر شور مچاتے، قہقہے لگاتے، ایک دوسرے کی روٹیوں اور بوٹیوں کے لیے چھینا جھپٹی کرتے اور پل بھر میں روٹھتے اور منتے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ سب کھانا کھاتے ہی اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آئیں گے۔ ایک دوسرے کو ٹھیل دھکیل کر اس کے قریب سے قریب تر ہونے اور اس کی گود میں بیٹھنے کی ضد کریں گے، کھیل کود، لڑائی بھڑائی، شکوے شکایت، سبق، اسکول، دوستیاں، دشمنیاں، دنیا جہاں کے قصے بیان کریں گے۔

لیکن اب ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ ہر روز بوجھل قدموں سے وہ اپنے کمرے میں آتی اور دیر تک بستر پر پڑی اپنے بچوں کا انتظار کرتی۔ برابر کے کمروں سے آئی ہوئی آوازوں کو سنی اَن سنی کرنے کی کوشش کرتی۔ ان کی محرومیوں پر اپنے لیے طنزیہ جملے اس کی سماعت سے ٹکرا کر دیر تک گونجتے رہتے۔ یہاں تک کہ اس کے کانوں میں خوفناک سائیں سائیں اور پیروں تلے گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس کے پورے وجود میں لرزش شروع ہو جاتی اور وہ پسینے میں تر بتر

AC کا سوئچ آن کرنے کو لڑکھڑاتے قدموں سے بڑھتی۔

آج تو سرِشام ہی سے گھر میں غیر معمولی سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ آج دوپہر ہی سے وہ سب کے سب برابر کمرے میں سر جوڑ کر فیصلے کرنے میں مصروف تھے۔ فضا میں ہولناک سناٹا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ شکایتی حروف کے زہریلے سانپ اب اس پر حملہ آور ہوں گے۔ شاید اسی لیے اِس خنک شام میں بھی گھٹن، گرمی اور حبس کا شدید احساس ہو رہا تھا۔

خطرہ ہر لمحے نزدیک تر آتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن کی رفتار بہت بڑھ گئی تھی۔ عجیب وغریب آوازیں طوفان کا شور برپا کر رہی تھیں۔ اس شور میں ان سب کے قدموں کی چاپ نمایاں تھی اور لمحہ لمحہ قریب سے قریب تر آ رہی تھی۔

وہ بدستور اپنے بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ یہ بستر وہی تھا جس پر وہ سب ایک ساتھ اس کے پاس ہوتے اور اس سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کی ضدیں کرتے تھے۔ سب ایک ساتھ اُودھم مچاتے تھے اور وہ چادر کو سمٹنے اور اسپرنگ کے ٹوٹنے کا واویلا کرتی اور ایک ایک کو اپنے قریب تر سلانے کی کوشش میں خود سمٹ سمٹا کر مڑتڑ کر سو جاتی تھی۔

اور آج وہ اسی بستر پر جس کی چادر شفاف اور بے شکن تھی خاموش بیٹھی آنے والے طوفانی لمحوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سب اس کے سامنے آ بیٹھے تھے۔ ہتھیاروں سے لیس اس کے مقابل صف آرا تھے۔ زندگی میں پہلی بار اسے شدید کمزوری کا احساس ہوا اور اس نے بے چارگی اور امید بھری نظروں سے باری باری ایک ایک کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک بھی اس کے کانپتے ہوئے شکستہ وجود کو اپنے بازوؤں کے حصار میں محفوظ نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں سے کوئی تو ہو جو زلزلے اور طوفان کی زد سے اسے بچالے اور وہ کسی ننھے سے بچے کی طرح ان کے سینے پر سر رکھ کر ایسی گہری نیند سو جائے کہ پھر نہ اٹھے۔

اس نے شکاریوں میں گھرے ہرن کے بچے کی طرح ایک ایک کو رحم طلب نظروں سے دیکھا۔ اُن کے درشت چہروں پر نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ حروفِ شکایات ان کے ہونٹوں سے نکل کر اس کے دل پر برس رہے تھے۔

"Wrong Planning"

"Wrong Decision"

Wrong Administration"

لا پرواہی، لاتعلقی، عیاشی، خود غرضی، الزامات آگ کے شعلوں کی طرح ہر سمت سے اس پر برس رہے تھے اور اس کے وجود کو جھلسائے دے رہے تھے۔ ان کی فرد جرم کا ہر لفظ حرف حرف بکھر کر اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔

اچانک اسے یوں لگا جیسے Wrong کا 'O' پھندا بن کر ایک جھٹکے سے اس کی گردن میں آ پھنسا۔ 'W' نے بل کھا کر اس کے سارے جسم کو جکڑ لیا۔ اس نے بھاگنا چاہا تو 'R' کی پھیلی ہوئی ٹانگوں نے اڑنگا لگا کر اسے گرا دیا۔ عیاشی کے 'ع' نے اپنی زنبور نما چونچ سے اس کی بوٹیاں نوچنی شروع کر دیں۔ اور وہ بے دم ہو کر بستر پر گر پڑی۔ حروفِ ملامت پورے طیش و غضب سے اس پر حملہ آور تھے۔ کاری ضربیں لگا رہے تھے اور وہ چیخیں مار رہی تھی۔ اس کا وجود پارہ پارہ ہوا جا رہا تھا اور ریزہ ریزہ ہو کر دھنکی ہوئی روئی کی طرح نرم، ملائم اور لطیف بن کر فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ خوف اور تھکن سے دور وہ اپنے وجود کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی، ہوا کی طرح ہلکی ہو کر نامعلوم فضاؤں کی جانب اڑی جا رہی تھی۔

عالی شان بنگلے کے لان میں سے کسی نے پوچھا:

''جنازہ کب اٹھے گا؟''

بھیڑ میں سے کسی نے اپنے کسی ساتھی سے سرگوشی کی:

''مرحومہ نے تمام عمر دنیا ہی کمائی۔ اللہ مغفرت کرے''

☆☆☆

سنگ سار

بہت دیر سے بستر پر آنکھیں بند کیے وہ رات کے گزرنے اور صبح کے ہونے کو محسوس کر رہی تھی۔ سورج کی کرنیں کھلی ہوئی کھڑکی سے اس کی آنکھوں میں سمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ مندی ہوئی آنکھیں یوں ہی بند رہیں۔ آنکھیں جو بیتے ہوئے دنوں کے سپنوں سے بسی ہوئی تھیں۔ اور آج کے بعد اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں چھپے ہوئے خوابوں کو حقیقت کی گرم دھوپ فنا کر دے گی۔ کیونکہ آنے والا دن آٹھ نومبر کا تھا۔

تمام رات وہ اپنے بستر پر تڑپتی تھی۔ یادوں کے پرے وڈیو فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے رہے تھے۔ گرد و پیش کے سکوت اور سناٹے کے حصار سے نکل کر حال کے جنگلوں میں الٹے پیروں چلتی ہوئی وہ وہاں پہنچ گئی تھی جس کے آگے شفقتوں

اور پیار کے خنک جھرنوں کی مترنم آوازیں تھیں، خوشگوار آسودگی کی وہ فضا تھی جس میں وہ عامر کا ہاتھ پکڑے نہ جانے کتنی صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ ویڈیو فلم کے کیسٹ کی ابتدا اس کے بچپن کے ان دنوں سے ہوتی ہے جب گرمیوں کی دوپہر میں وہ عامر کے ساتھ امبیاں چنتی اور املیاں توڑتی۔ برسات کی رم جھم اور کالے بھیگے بادلوں کے سائے میں وہ اور عامر جامن کے درخت کی شاخیں جھکورتے اور دوڑ دوڑ کر جامنوں کی چوٹ کھاتے ہوئے چنتے اور قہقہے لگاتے۔ درختوں سے لگے جھولوں میں ساتھ ساتھ پینگیں لیتے۔ سردیوں کی راتوں میں انگیٹھی کے گرد دادی اماں سے نئی نئی کہانیاں سنتے وہیں سو جاتے اور صبح پراسرار کہانیوں کے پراسرار خوابوں پر حیران ہوتے اور آپس میں خوب لڑتے۔

اور پھر جب منظر بدلتا تو وہ عامر کے ساتھ مولوی صاحب کے سامنے ہل ہل کر آموختہ پڑھتی نظر آتی۔ دونوں ساتھ ساتھ بستے گلے میں ڈالے اسکول کو جانے والی سڑک پر دوڑتے نظر آتے۔ اسی گھر کے آنگن میں چاندنی راتوں میں دھوپ چھاؤں کھیلتے ہوئے ہر جگہ عامر اس کے ساتھ ہوتا۔ اسکول سے کالج تک بے شمار اہم اور غیر اہم واقعات وہ ایک دوسرے کو سنانے کے لیے بے چین رہتے۔ تہواروں اور تقریبات کی دھوم دھام میں ہر چیز کی خریداری کے لیے بار بار بازار کی طرف دوڑنا ایسے ہر موقع پر عامر اس کے ساتھ ہوتا۔ کالج میں ہر مضمون کے سلسلے میں عامر کا سہارا لینا اس کا معمول تھا۔ معاشیات اور ریاضی کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے گھنٹوں وہ دونوں سر جوڑے بیٹھے رہتے۔ یادوں کی ویڈیو فلم فلیش بیک میں چلتی اور عامر کا وجود اسے ہر جگہ اپنے سائے میں لیے ہوئے چلتا۔ ہر پگڈنڈی، ہر موڑ اور ہر شاہراہ اس کے وجود سے روشن ہو جاتی۔ مسرت و اطمینان کے اس ماحول میں وقت کی صبا رفتاری کے ساتھ وہ ایک دوسرے کی شخصیت میں ضم ہوتے نہ جانے کب سے چلتے جا رہے تھے۔

عامر کی مضبوط شخصیت وہ تناور درخت تھی جس کے گرد فرن کی نازک بیل کی طرح وہ اپنی سرسبزی پر نازاں پھیلتی ہی چلی گئی۔ ہر شاخ پر اس کی ننھی ننھی کونپلیں اس کے بازوؤں کو

سہلاتی، تھپکتی رہتیں اور غیر محسوس طور پر اس کے وجود سے منسلک ہوتی چلی گئیں۔ آج سات نومبر ہے۔ یہی وہ دن ہے جب برسوں پہلے وہ دھوم دھام سے بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی جس کے آنگن میں بیری کے درخت پر طوطوں کی ڈاریں اترتی تھیں اور بیریاں کتر کتر کر پھینکتے ہوئے ان کی دھیمی دھیمی سرگوشیوں سے سارا آنگن آج بھی ویسے ہی گونج رہا ہے۔ بیریں عامر کو بہت پسند تھیں اور اب بھی وہ ہر صبح سنہری، شنگرفی بیریں بید کی باسکٹ میں ہرے پتوں کے درمیان سجا کر رکھ دیتی۔ سات نومبر کی صبح پچھلے دس برسوں سے یونہی طلوع ہوتی تھی کہ رات بھر گزرے ہوئے برسوں کا ایک ایک لمحہ، ساری رات قطرہ قطرہ اس کے دل پر ٹپکتا رہتا۔ بیتی ہوئی مسرتیں پہاڑ کے بادلوں کی طرح اس کی جاگتی آنکھوں میں دھند بن کر اترتی رہتیں۔ پھر یہ نرم خنک بادل ایک دم سے انقلاب کے سیاہ مہیب پہاڑ سے ٹکرا کر شیشے کی کرچیاں بن جاتے جو اس کے پورے وجود میں چبھ کر اسے سراپا زخم بنا دیتے۔ ہر سال وہ اپنے زخمی وجود کو گھسیٹتی ہوئی تاریک جنگلوں میں بھٹکتی، سنگین سناٹے کی دیواروں میں سے نکل کر بے کفن لاشوں کے درمیان سے راستہ بناتی، ہر قدم پر ان سے ٹکراتی اور تھک کر چور چور ہو جاتی۔ ہر سال اس ایک رات میں وہ برسوں کا طویل سفر طے کرتے کرتے نڈھال اور درماندہ ہو جاتی۔

لیکن آج سات نومبر کی اس رات کو تو جیسے ہر قدم پر بے کفن لاشوں نے اپنی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس پر گاڑ رکھی تھیں۔ ماں کی ممتا، باپ کی وارفتگی، بہن بھائیوں کی چاہت، ایک ایک کا پیار اور تمام شفقتوں نے جیسے اس پر یلغار کر رکھی تھی۔ اپنی اپنی محبت اور پیار کا واسطہ دیتے ہوئے، گزرے ہوئے تمام آسودہ لمحوں کو نچھاور کرتے ہوئے وہ سب اس سے دامن کشاں تھے۔ اور ہمیشہ کی طرح عامر کا پیار ان سب پر محیط تھا۔ لیکن آج اسے گزرے ہوئے راستوں کی تمام دھول سمیٹ کر ان قبروں کو پاٹنا ہے اور ان بے کفن میتوں کے ساتھ اپنے وجود کو بھی دفن کر کے حال کے بہتے پانیوں میں خود کو چھوڑ دینا ہے۔ ویڈیو فلم کی طرح

نظروں کے سامنے سے گزرنے والے ان مناظر میں عامر کہاں تھا۔ وہ تو اس کے گرد بے کفن بکھری ہوئی لاشوں کے ڈھیر میں بھی نہ تھا۔ وہ کہاں گم ہوگیا تھا؟

اور پھر جب منظر بدلتا ہے تو محسن اس کے سامنے تھا۔ اب تو اسے محسن کے ساتھ جینا ہے۔ محسن جس نے اس قیامت میں اسے سہارا دیا جب اس جیسی ہزاروں عورتوں کے وجود غلاظت سے بجبجاتی دلدل میں گم ہو گئے تھے۔ لیکن محسن تھا جس نے اس کے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے وجود کو محبت سے اٹھایا، دھویا اور پیار کے نرم تولیے میں اسے لپیٹ کر عزت و وقار کا لباس پہنایا۔ محسن کے لیے اس کا دل عقیدت و احترام کے جذبات سے معمور ہے۔ جس نے گزشتہ برسوں سے اُسے اپنے من مندر کے سنگھاسن پر یوں سجا رکھا ہے جیسے اسے سوئمبر میں جیت کر لایا ہو۔ سوئمبر، جس میں وہ لاشوں کے درمیان راج کماریوں کی شان سے کھڑی تھی اور اس کے مقابل کھڑے تنہا راج کمار محسن کے گلے میں ڈالنے کے لیے اس کے ہاتھوں میں کوئی مالا بھی نہ تھی۔ محسن، جس نے گلی میں رلنے والے پتھر کے ایک حقیر ٹکڑے کو اٹھا کر مسجد کے مینار میں نصب کر دیا تھا اور یوں اسے بلندی نصیب ہوئی تھی۔ اب تو اسے محسن ہی کے لیے جینا تھا جس نے اس کی خاطر اس کے عزیزوں کے خون سے رنگین گھر کو اپنی محبت کی پھوار سے دھونے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ لیکن اپنے گھر کی دیواروں کے بیچ اکثر اسے اپنے پیاروں کے چہرے جھانکتے نظر آتے۔ ان سب میں عامر کا چہرہ نمایاں ہوتا جس نے محبت کے ڈھیروں پھول اس پر نچھاور کیے تھے۔ اسے ممتا کی لذت سے آشنا کیا تھا۔ لیکن اب اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ اب تو وہ محسن کی امانت ہے۔ وہ محسن جسے اس نے سب کچھ کھو کر پایا ہے اور جو اپنے خون جگر سے اس کے لیے جنت کی تعمیر کا عزم لیے ایک اجنبی دیس میں بے وطنی اور جدائی کا کرب جھیل رہا ہے۔ سال میں صرف ایک بار ایک مہینے کے لیے آتا ہے اور اس کی اداس زندگی میں خوشیوں کے پھول کھلانے کی نوید سنا کر چلا جاتا ہے۔ اور اس کا اپنا دل جو دیوار پر لٹکے ہوئے کلاک کی طرح سال بھر ساکت رہتا ہے اور صرف سات نومبر کو ٹک ٹک کر کے دھڑکنے لگتا

ہے۔ ہر گھنٹے بجتا ہے اور آٹھ نومبر سے پھر ویسا ہی ساکت ہو جاتا ہے۔

لیکن اب وہ یہ سلسلہ ختم کر دے گی۔ دیوار سے لٹکے ہوئے اس پرانے کلاک کو اتار دے گی جو اسے اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور اپنے اکلوتے بچے کی بے کفن لاشوں کی یاد دلا دلا کر اسے رلاتا ہے۔ اب تو وہ اس دیوار پر وہ خوبصورت، سنہری ڈیجیٹل گھڑی آویزاں کرے گی جو اس کا محسن بیرون ملک سے لایا تھا اور جس سے ہر تیس منٹ بعد موسیقی کی دھنیں پھوٹتی تھیں۔ اب وہ موسیقی کی اس دھن سے خود کو ہم آہنگ کر دے گی اور محسن کے پیار کی حدت محسوس کیا کرے گی۔ پچھلی رات اس کی یادوں کی شب آخر تھی اور سوگوار دن ماضی کی ان تلخ یادوں کا تتمہ تھا جسے آج وہ دفن کر دے گی۔ پچھلے دس برسوں سے سات نومبر کی اس تاریخ کو وہ اپنے گھر کو عامر کی پسند کے مطابق سجاتی۔ بڑی محنت اور شوق سے اس کی پسندیدہ ڈشز تیار کر کے میز پر سجا دیتی اور پھر اپنے سوٹ کیس کی تہہ سے اپنا عروسی جوڑا نکال کر پہنتی، اپنی پسندیدہ خوشبو اسپرے کرتی۔ جا بہ جا گھر والوں کی تصویریں آویزاں کرتی۔ بڑے اہتمام سے عامر کی بڑی سی تصویر نکال کر گود میں رکھ لیتی اور اپنے کامدار آنچل سے اس پر ٹپکنے والے آنسوؤں کو پونچھتی۔

نہ جانے کب تک اسی طرح وہ فریم کو دھوتی اور پونچھتی رہتی یہاں تک کہ ابتدائی سردیوں کی خنک ہوا اس کے گالوں پر آنسوؤں اور اس کے آنچل کو خشک کر دیتی۔ اور تب وہ تصویر کو اس کی مخصوص جگہ پر لگا کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور اس کے بولتے ہونٹوں اور چمکتی ہوئی شریر آنکھوں سے وہ سب کچھ سنتی رہتی جو اس کے ذہن پر نقش اور کانوں میں رچے ہوئے تھے۔ پھر سناٹے کی آواز پر اس کی آوازیں حاوی ہو جاتیں۔ ہر شے معدوم ہو جاتی اور اس کا اپنا ماحول اور اپنے پیاروں کی آوازوں سے گھر کا سناٹا گونج اٹھتا۔ شام تک وہ ان ہی آوازوں میں کھوئی خاموش بیٹھی رہتی یہاں تک کہ شام کی سوگواری رات کے اندھیرے میں ڈھل جاتی۔ ہر صورت دھندلی ہوتے ہوتے معدوم ہو جاتی۔

آج بھی سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا۔ مگر آج اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا یہ ماتم بہت دل گداز تھا۔ آج اسے اس اہرام کو ڈھا دینا تھا جس کی ہر دیوار پر اس کے پیاروں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ اس خیال سے بار بار اس کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا کہ ماضی کے یہ نقوش جن کے ساتھ وہ مر کر بھی زندہ تھی ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گے۔ سب مر جائیں گے اور صرف وہ زندہ رہے گی۔

لیکن وہ کیوں زندہ رہے گی؟ اس سوال کی درانتی نے جیسے اس کے وجود کو چیر ڈالا۔ اور اب اس کے آنسوؤں کو پونچھنے والا، ان کی نمکینی کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر لینے والا کوئی نہیں رہا۔ ہر طرف سائیں سائیں کرنا سناٹا اسے ڈس رہا تھا۔ وہ بے سدھ ہو کر مسہری پر گر گئی۔ ابلتے ہوئے آنسو گالوں سے ڈھلک ڈھلک کر اس کے سرخ عروسی ڈوپٹے میں جذب ہوتے رہے اور خنک ہوا کے جھونکے ان کو خشک کرتے رہے۔ سامنے عامر کی تصویر مسرت آمیز شرارت سے اسے تکے جا رہی تھی۔ باہر نومبر کی چمکیلی دھوپ ڈھل چکی تھی اور شام غریباں کی اس تنہائی میں۔ مہیب سناٹے میں گھری ہوئی وہ اپنے وجود سے بے نیاز فوٹو فریم پر سر رکھے دیر سے نڈھال سی بیٹھی تھی۔ اچانک بہت دور سے آتی ہوئی کال بیل کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی اس کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ بہ مشکل کھڑکی تک گئی۔

اور اس کا ڈوبتا ہوا دل ایک دم سے اچھل کر جیسے حلق میں آ رکا۔ شام کی ملگجی روشنی میں اس نے سامنے کھڑے شخص کو بے یقینی سے دیکھا۔ یہ تو وہی تھا۔ بالکل وہی۔ وقت کی کڑی دھوپ نے اس کے بالوں کو جھلسا دیا تھا اور چہرہ غم کی آنچ سے سنولا گیا تھا۔ باقی سب کچھ وہی تھا۔ اس نے جھپٹ کر دروازہ کھولا اور وہ جھجکتا ہوا اندر آیا اور وہ خواب زدہ سی اس کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سما گئی۔ یہ ہوش کا آخری لمحہ تھا۔ غم ہجراں کا بے آواز شکوہ، خواب نما انبساط کا نامعلوم احساس جیسے دھڑکنوں میں اترتا چلا گیا۔ سرخوشی اور سرشاری کے لمحات بیتے جا رہے تھے کہ عامر کی سرگوشی نے ایک دم سے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہہ

رہا تھا ''سب کچھ ویسا ہی ہے کچھ بھی نہیں بدلا'' وہ یک لخت اس کے بازوؤں کے حصار سے نکل کر علیحدہ کھڑی ہوگئی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اب کچھ بھی ویسا نہ رہا جیسا وہ چھوڑ گیا تھا۔ لیکن عامر کے جذبے کی شدت میں وہ الفاظ اس سے ادا نہ ہو سکے۔

سرشاری کے ان لمحات میں وہ اسے اس انقلاب کے بارے میں بتانا چاہ رہی تھی جو اس کے وجود کو روند کر چلا گیا اور یہ کہ اب وہ دوسری کشتی میں سوار ہو کر کسی اور کے ساتھ بہت دور جا چکی ہے۔ وہ جس نے اسے قلزم خوں سے نکالا اب اس کا ناخدا بھی ہے اور ہم سفر بھی اور وہ سب کچھ جو کبھی تھا خون کے دریا میں بہہ گیا اور یہ کہ زندوں کا تعلق مردوں سے ممکن نہیں لیکن عامر کے جذبے کی شدت اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دے رہی تھی۔

بہت دیر بعد جب طوفان تھما اور آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا تو وہ حیرانی اور پریشانی کے عالم میں روتے ہوئے عامر کو دیکھ رہی تھی اور اب بھی یہ الفاظ اس کے ہونٹوں سے باہر آنے کے لیے بے تاب تھے کہ اس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں رہا اور ابھی اس کے اس طرح اچانک آ جانے سے پہلے وہ اپنی محبت کی صد سالہ پرانی ممی کو دفن کرنے جا رہی تھی۔ لیکن عامر کے آنسوؤں نے اسے بے کل کر دیا تھا اور وہ بے اختیار اس کے گلے سے لگ گئی تھی۔ یہ ہوش کا آخری لمحہ تھا جو اس کی گرفت سے چھوٹ گیا۔ کمزور سی مرجھائی ہوئی فرن کی باریک جڑیں پائن کے کھردرے تنے سے خود بخود لپٹتی چلی گئیں اور ہمیشہ کی طرح اس کی نازک جھالریں شاخوں کا جھومر بن گئیں اور پہاڑ کی دھند اس کے چاروں طرف اس طرح پھیل گئی کہ مانوس خنکی اور آسودگی کے احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ایک دم سے کیسٹ ریوائنڈ ہوگئی اور وہ اسی ماحول میں پہنچ گئی جہاں وہ ازل سے رہ رہی تھی۔ پہاڑوں کی اسی بلندی پر جہاں بادلوں سے باہر کوئی اور دنیا نہیں تھی۔ وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ اور جب اسے ہوش آیا تو اس کا حساب گم ہو چکا تھا۔ عامر اسے جلد سے جلد اپنی دنیا میں واپس لے جانے کے لیے ضروری کارروائی کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ دھند چھٹ چکی

تھی۔ بادل بہت دور گہری وادیوں میں اتر چکے تھے اور سورج سوا نیزے پر چمک رہا تھا اور تپتی زمین پر وہ اس احساس سے پگھل رہی تھی کہ عامر اپنے جذبے کی شدت میں اس کی اصلی صورت دیکھے بغیر ہی چلا گیا۔

اور اب محسن کامیابی کے نشے میں سرشار آنے ہی والا تھا اور آتے ہی وہ اپنے تاج محل کا ذکر پورے جوش وخروش سے شروع کر دے گا۔ لان، ٹیرس، ڈرائنگ، ڈائننگ، صوفے اور پردوں کی میچنگ۔ اس پُر مسرت زندگی کی نوید جس میں وہ آدم وحوا کی سی زندگی بسر کریں گے۔ لیکن اب وہ اسے کیسے بتائے گی کہ اس کی حوا شجر ممنوعہ کے نا کردہ گناہ کی مجرم، جنت کے لباس سے محروم اپنی برہنگی پر کانپ رہی ہے۔ اس کا پورا وجود یخ ہو چکا ہے۔ اور اس کا دم اس تصور سے گھٹ رہا تھا کہ وہ محسن کو کس طرح بتائے گی کہ اس کا گم شدہ راستہ مل گیا ہے۔ یہ انکشاف اس کے لیے ایک دھماکہ ثابت ہوگا اور جفاکشی اور ایثار سے تعمیر ہونے والے خواب ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اس انکشاف سے اس پر کیا گزرے گی اس تصور نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ وہ صرف اس کا محسن ہی نہیں ہے بلکہ اب خوشیوں اور ولولوں سے بھرپور اس کی زندگی کا محور ہے۔ اس کی محبت کو وہ ملبوں کا ڈھیر کس طرح بننے دے گی۔ وہ اس کی آرزوئیں پوری کرے گی کہ اس کے ساتھ اس کے ہرے بھرے لان میں فوارے کی پھوار میں بیٹھ کر شام گزارے گی۔ چاندنی راتوں میں مالتی کے پھولوں سے بھری جھالروں والے ٹیرس پر معطر چاندنی میں اس کے ساتھ مخمور ہونے کے خواب ضرور پورا کرے گی۔ یہ ان دونوں کا حق ہے۔ عامر، امی، ابو اور اس کا ننھا سب اب ماضی کی گرد میں دب چکے ہیں، خواب بن چکے ہیں۔

لیکن عامر تو اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آ رہا تھا۔

کاش اس نے یہ خواب نہ دیکھا ہوتا۔ ایسی جان لیوا آرزو نہ کی ہوتی۔ اس نے سوچا کہ عامر کی واپسی سے پہلے وہ یہ گھر چھوڑ جائے گی۔ وہ آئے گا اور ناکام چلا جائے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی عامر کا ملول چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ وہ دل شکستہ انسان جو اس کے دائمی قرب کے خیال سے مر کر زندہ ہونے جا رہا تھا۔ وہ شخص جس کے لمس نے اس کی روح کا اس کے جسم کے ساتھ رشتہ جوڑ دیا تھا۔ اس کے بغیر اس کا وجود بے معنی تھا۔

اس کے ساتھ ہی اسے محسن کا خیال آیا۔ وہ کس طرح اس کے پُرشوق جذبوں کا ساتھ دے گی۔ اور عامر اس حقیقت کو کس طرح برداشت کرے گا کہ وہ برسوں سے محسن کی بیوی ہے۔ نہیں ...... اب وہ کسی کی بیوی نہیں ہوسکتی۔ پورے دو دن اور دو راتیں اس نے اپنے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کی اور تب اس نے اس حقیقت کو جسے وہ ان دونوں کے سامنے ادا کرنے سے قاصر رہی ہے لفظوں کے سہارے ان تک پہنچا دے گی۔ شاید وہ دونوں اسے اس دلدل سے نکالنے کی کوئی تدبیر کریں جس میں وہ گردن تک دھنس چکی تھی۔

اور آج ڈاک کے ایک جیسے دو لفافے اس کے سامنے میز پر پڑے تھے۔ لیکن وہ ان لفافوں کو چھونے اور ان کو کھولنے سے خوفزدہ تھی۔ صبح سے دوپہر ہوگئی اور پھر دوپہر بھی سنولانے لگی۔ بڑی ہمت کر کے اس نے وہ لفافہ کھولا جس پر عامر کی تحریر تھی۔ عامر نے اس کی پُرسکون اور پُرآسائش زندگی کو مفلوک الحالی میں تبدیل نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اسے باضابطہ طلاق سے نواز دیا تھا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ شدید اضطراب کے عالم میں اس نے محسن کا خط کھولا۔ اس نے لکھا تھا کہ بھٹکے ہوئے پرندے کو اگر اس کا گھونسلہ مل جائے تو پرندے کی اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ واپس اپنے گھونسلے میں چلا جائے۔ اس نے لکھا تھا کہ تم میری طرف سے آزاد ہو۔ اس کا سر درد کی شدت اور ہفتوں کی بے خوابی سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے میز کی دراز سے خواب آور گولیوں کی شیشی نکالی اور اپنی ہتھیلی پر انڈیل کر گنے بغیر نگل گئی۔ پھر اس نے پانی کا بھرا ہوا گلاس اٹھایا اور ایک سانس میں خالی کر دیا۔

☆☆☆

بے بال وپر

اور جب وہ اپنے کمرے میں تنہا پڑے پڑے اکتا جاتا تو اپنے کمپاؤنڈ میں لگے اس گھنے اور سرسبز درخت کے سائے میں جا بیٹھتا جو ان دنوں اس کی تمام دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ پہروں وہ اس کے اونچے قد، دور دور تک پھیلی ہوئی سڈول شاخوں اور اُن پر لگے ہوئے سبز چمکدار پتوں کو بہار کی سبک خرام ہواؤں میں رقص کرتے دیکھتا۔ چمکیلے پتوں میں ملبوس شاخیں جیسے اترا اترا کر سرگوشیوں میں جوانی اور اُس کی بیتاب امنگوں کی باتیں کرتیں، نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے دودھیا بادلوں کی سبک خرامیوں پر جھومتیں اور ہوا کے زور سے یوں تن جاتیں جیسے بادلوں کو چھولیں گی۔ جوانی سے سرشار اس تناور درخت کی ایک ایک ادا میں وہ پہروں گم رہتا۔ چمکیلے سبز پتے سورج کی نرم، گرم اور مہربان کرنوں کو جیسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لینا چاہتے ہوں، ہمکتی، ڈولتی اور جھومتی شاخیں روشن اور چمکیلی دھوپ میں اپنا سینہ پھلائے تازگی

اور توانائی سمیٹتی اسے بڑی بھلی لگتیں۔

اسی درخت پر ایک زرد، اُداس اور تنہا پتا بھی تھا جس کی تازگی اور رنگت کو خزاں کے بے رحم ہاتھوں نے پامال کر دیا تھا اور اب وہ زبانِ حال سے اپنے اجڑے ہوئے شباب کا نوحۂ الم سنا رہا تھا۔ وہ اس اداس اور تنہا پتے کو بڑی حسرت سے دیکھتا جس کا رنگ دھوپ میں جل جل کر بھورا ہو گیا تھا، جس کی رگوں میں قوت نمو اور نمی کی آخری رمق بھی ختم ہو چکی تھی مگر مکڑی کے ایک جالے کے سہارے وہ اب بھی درخت سے لٹکا ہوا تھا اور کسی طرح اس کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ بھری بہار میں اس سوکھے چرمرے پتے نے گویا ان جوان شاخوں کی مضبوط بانہوں کا سہارا لے لیا ہو۔ لیکن درخت کی شاخیں اور ہرے ہرے شاداب پتے جیسے اسے اپنی پناہ میں لینے سے گریزاں ہوں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ زور زور سے جھوم جھوم کر اپنا دامن اس سے بچا رہے ہوں۔ یوں جیسے اس سُوکھے مرے پتے کے کھردرے لمس سے اُن کی مخملیں سطح کے داغدار ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ شاید وہ اپنی روشن پیشانی پر بدنمائی کا یہ داغ برداشت کرنے کے روادار نہ تھے۔ حالانکہ مکڑی کے جالے سے لٹکتا ہوا یہ پتا تیز ہوا کے جھونکے سے کسی بھی لمحے زمیں بوس ہو سکتا تھا۔

اپنی شاخوں کے ساتھ مضبوطی سے جڑے ہوئے ان گنت پتے ایک تنہا، اداس پتے کو سہارا نہیں دے رہے تھے اور وہ بڑی بے بسی سے جھولتا ہوا زندگی کی دہائی دے رہا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا کہ تیز ہوا کے جھونکے اسے جھنجھوڑے ڈال رہے ہیں۔ اس کی کمزور سوکھی پسلیاں تنے سے ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ رہی ہیں لیکن وہ جو اپنی شاخوں کے ساتھ مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں، تالیاں بجا بجا کر اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ وہ اداس ہو کر تھرتھراتا کانپتا اپنے کمرے میں جا کر لیٹتا تو اس کے سر کا درد اور بڑھ جاتا۔ اُس میں اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں بند کرنے کی بھی سکت نہ رہتی اور لندن اور نیویارک سے آئے ہوئے اس کے بیٹوں کے خطوط تیز ہوا سے کمرے میں اِدھر اُدھر اڑتے رہتے۔ اور اُن اڑتے ہوئے

اوراق سے اسے اپنی بہوؤں کی چوڑیوں کی کھنک اور پوتوں کے معصوم قہقہے سنائی دیتے۔

اور پھر انہی تصورات میں گم اسے نیند آنے لگتی۔ چوڑیوں کی کھنک اور معصوم قہقہوں کی جھنکار مدھم پڑتے پڑتے فیڈ آؤٹ ہو جاتیں۔ پھر صبح جب اس کی آنکھیں کھلتیں تو وہی تناور چھتنار درخت اس کے سامنے آ جاتا۔ وہ کمرے کی کھلی کھڑیوں سے باہر دیکھتا تو درخت چڑیوں کے چہچہوں سے گونج رہا ہوتا۔ گھنی شاخوں اور سرسبز پتوں کے درمیان ہی چڑیاں چوں چوں کرتی بہار کی صبح کا خیر مقدم کرتیں۔ نئے نئے پتوں میں پھدک پھدک کر آنکھ مچولیاں کھیلتیں۔ کبھی چونچ سے چونچ ملا کر بڑے پیار سے خاموش بیٹھی ہوتیں جیسے فضا کا تمام سرور اپنے وجود میں اتار لینا چاہتی ہوں۔ کبھی ایک دوسرے کے سروں پر ہلکی ہلکی ٹھونگیں مارتیں۔ چونچ سے پروں کو کریدتیں۔ ایسے میں اُن کی چوں چوں میں ایک عجیب نغمگی اور وارفتگی ہوتی۔ ایک ایسا رسیلا پن کہ وہ اپنے آپ کو پیار کی لہروں میں بہتا ہوا محسوس کرتا۔ چڑیوں کو ایک دوسرے کے گرد دیوانہ وار رقص کرتے دیکھ کر وہ اپنے جوڑوں کا درد بھی بھول جاتا۔

بہار کے چہچہوں سے آباد اِس درخت کے پتے یوں لہراتے گویا چڑیوں کے گیت پر تالیاں بجا رہے ہوں۔ ایسے میں مکڑی کے جالے سے لٹکتا ہوا وہ تنہا، سوکھا اور اداس پتا بھی جس کا رنگ اب بھورے سے سیاہ پڑتا جا رہا تھا، معطر ہواؤں میں یوں لرزتا جیسے درخت پر آباد چڑیوں کے گیت پر سر دھن رہا ہو۔ درخت سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود وہ درخت سے لٹکا ہوا تھا۔ یہ احساس کیسا اطمینان بخش تھا۔

اور پھر جب سردیوں کی رُت بیت گئی اور موسم گرما کا آغاز ہوا تو چڑیوں کی والہانہ چوں چوں میں ایک ٹھہراؤ اور گمبھیرتا پیدا ہوئی۔ سب کی سب ایک دم سے مستقبل کی فکر میں سرگرداں نظر آنے لگیں اور گرے پڑے تنکے اور گھاس پھوس سمیٹ کر اونچی اونچی محفوظ شاخوں کے درمیان آشیانوں کی تعمیر شروع ہو گئی۔ وہ اپنے درد سے ٹوٹتے ہوئے گھٹنوں کو تھامے، جھکا جھکا کسی نہ کسی طرح درخت تک آ جاتا اور پھر اُس کے تنے سے ٹیک لگا کر چڑیوں

کی آشیاں بندی کی جدوجہد دیکھتا رہتا۔ وہ ایک ایک کر کے تنکے، گھاس کی پتیاں اور پرانے چیتھڑے جانے کہاں کہاں سے چن چن کر لاتیں اور درخت پر پہنچاتی رہتیں۔ مختلف شاخوں پر نئے نئے گھونسلے بنتے گئے۔ اس کی دھندلی آنکھیں ان دنوں روشنی محسوس کرنے لگی تھیں۔ اس کے پیروں کی سوجن بڑھ گئی تھی مگر وہ تکلیف سے بے نیاز تھا۔

اور جب آم کا وہ درخت خوبصورت، سڈول اور گدرائے ہوئے پھلوں سے سج گیا تو چڑیوں نے اپنے گھونسلے بھی مکمل کر لیے لیکن درخت کے تنے کے ایک نچلے کھوکھلے حصے میں چڑیوں کے جس جوڑے نے اپنے گھونسلے بنائے تھے وہ نہ جانے کیوں اب تک نامکمل تھا۔ شاید وہ جوڑا اپنے گھونسلے کو بہت خوبصورت بنانا چاہتا تھا۔ شاید حسنِ تعمیر اور آراستگی کا ذوق اُن میں کچھ زیادہ تھا۔ وہ خود اپنی عمر کا انتہائی حسین اور جاندار حصہ اس ذوق کی نذر کرنے کے بعد ایک عرصے تک اپنے شاندار کارنامے پر فخر کرتا رہا تھا۔ اور جب وہ گھوم کر اپنے پیچھے کھڑے بڑھاپے کو دیکھتا، جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا تو اسے ایک لمحے کو چکر سا آ جاتا لیکن پھر وہ یوں مطمئن ہو جاتا جیسے چلچلاتی دھوپ میں ریگستان میں سفر کرتے کرتے اچانک کوئی لمبا اونچا سایہ دار درخت اسے اپنی امان میں لے لے۔

چڑیا کا وہ جوڑا جس کا آشیانہ ابھی نامکمل تھا۔ بڑی تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ چڑیا اپنی چونچ میں جانے کہاں کہاں سے رنگین دھاگے، طرح طرح کے پَر، کاغذ اور کپڑے کی دھجیاں اٹھا اٹھا کر لاتی۔ کبھی وہ اِدھر اُدھر دیکھتے، اس کے قریب بھی آ جاتی اور اسے چپ چاپ بیٹھے شک وشبہ کی نظر سے دیکھتی۔ پھر اس کے سامنے پڑے تنکے اٹھا اٹھا کر لے جاتی۔ یہ چڑیا اب اسے اس قدر بے ضرر سمجھنے لگی تھی کہ کھلی کھڑکی سے اس کے کمرے میں آ جاتی اور نیچے پڑے بوسیدہ مونڈھے سے لٹکتی رسیاں چونچ سے ادھیڑنے لگتی۔ شاید اپنے آشیانے کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے اسے ان رسیوں کی ضرورت تھی۔ بوڑھا آدمی شوق اور دلچسپی سے اس کے انہماک کو دیکھتا رہتا۔ ابتدا میں وہ بوڑھے کے قریب آتے ڈرتی تھی۔

پھر بیباک ہوگئی اور دیکھتی ہی دیکھتے مونڈھے سے تمام رسیاں نوچ کر لے گئی۔

اور پھر اس نے دیکھا کہ آم کے اس تناور درخت کے تنے میں ایک نیا گھونسلا اُبھر آیا، ایک نیا گھر آباد ہوا۔ اور چڑیوں کا وہ جوڑا بڑے اطمینان سے اپنے نوتعمیر گھر میں بس گیا۔ اور جب گھر بن جائے، مستقبل محفوظ ہو جائے تو تخلیقی عمل کے جاری ہونے میں کیا قباحت ہوتی ہے۔ چڑیا نے انڈے سینے شروع کر دیے تھے۔ وہ اس عمل کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا۔ اپنے انہماک میں وہ جوڑوں کا درد بھی بھول جاتا۔ ہر روز اپنی ڈبل روٹی کا ایک حصہ وہ فرش پر ڈال دیتا جسے چڑا اپنی چونچ سے اٹھا کر لے جاتا۔ چڑا ان دنوں بہت مصروف رہتا۔ اسے انڈوں پر بیٹھی چڑیا کے لیے دانہ چن چن کر لانا پڑتا۔ اپنی چونچ سے ایک ایک دانہ اس کے منہ میں منتقل کرنا پڑتا اور پھر اس کی جگہ انڈوں پر بیٹھنا پڑتا۔ تخلیق کے اس عمل میں باہمی تعاون کا یہ جذبہ دیکھ کر وہ مسکرا اٹھتا۔ چڑا بڑی سنجیدگی سے محنت کر رہا تھا اور بڑی بے صبری سے انڈوں سے بچے نکلنے کا منتظر تھا۔

دن میں کئی بار وہ چلچلاتی دھوپ میں نکل کر پیڑ تک جاتا۔ جھانک کر گھونسلے میں دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اور کان لگا کر بچوں کی چوں چوں سننے کی کوشش کرتا۔ پھر بیقراری سے واپس آ جاتا۔

اس کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے جوڑوں کے درد سے بھی بے نیاز ہوگیا اور جو کسی سہارے کے بغیر کھڑا بھی نہ ہوسکتا تھا، اب پنجوں کے بل کھڑا ہو کر گھونسلے میں جھانکا کرتا۔ ہر وقت کی کراہوں کا سلسلہ بھی رک سا گیا تھا۔ پھر جب آم کی سبز کیریاں چمکیلی دانے دار سفیدی میں تبدیل ہو رہی تھیں اور ابھی ان میں زردی نہ آئی تھی تو ایک دن چڑیا کے گھونسلے سے چوں چوں کی کمزور سی آوازیں ابھریں۔ بوڑھا گرتا پڑتا گھونسلے تک پہنچتا۔ چڑیا کا جوڑا گھونسلے کے اندر تھا اور ان کی خوشیوں بھری بے قرار چوں چوں کی آوازوں میں ایک باریک اور کمزور چوں چوں بھی شامل تھی۔

پھر ایک دن لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ وہ جو تقریباً مفلوج سا ہو کر اپنے کمرے تک محدود ہو گیا تھا، اپنے پیروں سے سیدھا چل کر پنساری کی دکان تک گیا۔ وہاں سے باجرے کے دانے خریدے اور چمکتی آنکھوں اور سیدھی کمر کے ساتھ واپس آ گیا۔ پھر جب آم پک کر پیلے ہو گئے تو درخت کا حسن اور نکھر آیا۔ ثمر دار شاخیں عجیب البیلے انداز سے جھومنے لگی تھی۔ اور پتے تو جیسے ہر وقت خوشی سے تالیاں بجایا کرتے۔ گرم لو کے تھپیڑوں میں ماضی کی یادگار وہ سوکھا، اداس اور تنہا پتا جو مکڑی کے جالے سے لٹکا ہوا تھا اب کچھ اور مضمحل ہو گیا تھا۔ تیز ہوا میں بے بسی سے ڈولتا سر سبز پتوں سے بھری شاخوں کو بڑی امیدوں سے تکا کرتا۔

اور اب چڑیا کے بچے جو کچھ بڑے ہو گئے تھے گھونسلے سے باہر اپنی ننھی ننھی چونچیں کھولے دانے کے منتظر ہوتے۔ باجرے کے دانے جو وہ درخت کے پاس بکھیر دیا کرتا تھا، ان کے والدین پھُر سے اڑ کر اُن تک پہنچتے اور دانے اٹھا کر لے جاتے۔

اپنی چونچ سے دانے اُن کے منہ میں ڈالتے جاتے۔ معصوم کالی آنکھوں والے بھورے بھورے سے دو بچے اب پروں سے آراستہ ہوتے جا رہے تھے۔ پھیلے ہوئے دہانے پروں سے ڈھک کر مختصر ہو گئے تھے۔ وہ ان نئے مکینوں کو دیکھ کر پھولا نہیں سمایا۔ جس گھونسلے میں ایک چڑے اور چڑیا نے اپنی زندگی شروع کی تھی، وہاں اب دو اور چڑیوں نے جنم لے لیا تھا۔ گھونسلے کی آبادی اور رونق میں اضافہ ہو گیا تھا۔

کچھ دنوں بعد یہ ننھے بچے بھی اپنے والدین کے ساتھ پھُدک کر اترنے لگے اور نیچے درخت کے قریب بکھرے دانے چگنے لگے۔ اب وہ تھوڑا تھوڑا اڑنا بھی سیکھ گئے تھے۔ والدین بڑے انہماک سے اپنے ننھے بچوں کو اڑنا سکھا رہے تھے۔ چوں چوں کر کے وہ ان کے سامنے اس طرح اڑتے جیسے کہہ رہے ہوں یوں اڑو بچو، شاباش! اور بچے سہم کر ننھے ننھے پر پھڑپھڑا کر رہ جاتے۔ چڑیاں پھر قریب آتیں۔ چوں چوں کر کے فہمائش کرتیں۔ کبھی

دلاسہ دیتیں۔

اور وہ یہ سارا تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا جیسے اُس کے بچے ٹھنک ٹھنک کر کہہ رہے ہوتے۔ ابا میں نہیں پڑھتا۔ مجھے نہیں آتا اس طرح لکھنا۔ ابا بس اب کل پڑھ لیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ خوف اور جھجک بہت جلد دور ہو جائے گی۔ پھر یہ ہونہار بچے بڑی عظمتیں حاصل کریں گے۔ اسے چڑیا کے نوزائیدہ بچوں کو دیکھ کر بڑا پیار آتا۔ ان کا ڈرنا، سہم سہم جانا، ہچکچا ہچکچا کر اڑنے کی کوشش کرنا اس کے لیے ایسا مشغلہ تھا جسے وہ پہروں بڑی توجہ سے دیکھتا۔ پھر ایک دن جب درخت کے نیچے چڑیا کا جوڑا اسی طرح بڑی محنت و مشقت سے اپنے بچوں کو اڑنا سکھا رہا تھا، دیوار پر بیٹھی ایک بلی جو نہ جانے کب سے ان کی تاک میں تھی، اچانک اجل بن کر اُن پر ٹوٹ پڑی۔ چڑیا کمزور تھی اور سہمی ہوئی تھی۔ وہ بلی کا لقمہ بن گئی۔ لیکن چڑا پنجے سے چھوٹ کر گر گیا۔ البتہ اس کے بازو پر ظالم بلی کے دانت ایسے لگے تھے کہ وہ خون سے تر زمین پر پھڑ پھڑا کر اڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اُس کا دل تڑپ اٹھا۔ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے اُس نے چڑے کو اس طرح اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا جیسے لٹے ہوئے سرمائے کی آخری پونجی۔ چڑا ہانپ رہا تھا۔ تھرتھرا رہا تھا۔ اور اسے کانپتے تھرتھراتے دیکھ کر بوڑھے کا دل بھی لرزنے لگا۔ اس نے جھٹ بستر کی چادر کے کنارے سے دھجیاں پھاڑ کر ٹھنڈے پانی میں بھگو بھگو کر اُس کے زخموں کو دھویا۔ پٹی باندھی اور پھر اسے دوا کے خالی ڈبے میں کپڑوں کے درمیان رکھ دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ بچوں کو دیکھنے باہر نکلا۔ وہ بچے جو اُڑنے کے خوف سے دُبکے رہا کرتے تھے، خطرہ دیکھتے ہی پُھر سے اڑ چکے تھے۔ اب آم کی ٹہنیوں پر دوسری چڑیوں کے ساتھ نئی اڑان کے غرور میں پھولے بار بار ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدک رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی اڑانوں کا مزا لے رہے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں، دیکھو ہم کسی کے محتاج نہیں۔ اب ہم خود اُڑ سکتے ہیں۔

درخت ویسے ہی چڑیوں کے چہچہوں سے گونج رہا تھا۔ زرد ہوتے آموں سے جھکی ڈالیاں اسی وقار سے آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ سورج کی کرنیں گھنے چمکیلے پتوں کے درمیان دھوپ چھاؤں کا وہی کھیل کھیل رہی تھیں۔ سوکھا اداس پتا اسی طرح جھومتی شاخوں کا سہارا مل جانے یا لٹکے رہنے کے عذاب سے چھوٹ جانے کی جدوجہد کر رہا تھا اور نیچے وہی بے کراں سناٹا تھا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے زخمی چڑے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ چڑے نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ کبھی کبھی ممنونیت سے شاید آنکھیں کھول کر ایک نظر جھریوں بھرے، دھندلی آنکھوں والے مہربان چہرے کو تک لیتا تھا اور ممنونیت کی یہ نظر اس کے ڈوبتے دل کو سنبھالا دے رہی تھی۔

اور اب وہ تن من سے زخمی چڑے کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ آخر کار ایک دن چڑے کے زخم بھر گئے۔ کئی دنوں بعد وہ پھر چڑے کے ساتھ اپنے کمپاؤنڈ میں نمودار ہوا۔ زرد اور جھکا ہوا سا۔ چڑے کو اس نے فرش پر رکھ دیا تاکہ وہ اڑ کر اپنے گھونسلے تک جا سکے جہاں شاخوں کے درمیان اس کے دونوں بچے بھی اڑتے آ گئے تھے۔

بچوں کو دیکھ کر اس کا افسردہ دل ایک دم سے کھل اٹھا۔ چڑا تنہا اور بے سہارا نہیں۔ اب اس کے دو بچے تھے، تندرست توانا اور مضبوط بازوؤں والے۔ اس نے چڑے کو اٹھا کر ایک شاخ پر رکھ دیا۔ اس نے پَر پھڑ پھڑا کر اڑنے کی کوشش کی اور زمین پر آ رہا۔ اس کے زخم تو اچھے ہو گئے تھے لیکن بازو قوت پرواز سے محروم ہو چکے تھے۔ چڑے نے زمین پر گر کر بے بسی سے چوں چوں کی اور اپنی ننھی منی آنکھوں سے اوپر چہچہاتے بچوں کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ آؤ بچو، مجھے سہارا دو! ایک بچہ چہچہا کر اوپر کی شاخ پر پھدک گیا۔ دوسرے نے چوں چوں کی اور بازو پھیلا کر دور بادام کے اونچے درخت کی جھومتی شاخ پر جا بیٹھا۔ چڑے نے فریادی انداز میں اپنی پوری چونچ کھول کر اوپر دیکھا اور زور زور سے چوں چوں کی۔ دوسرے بچے نے بھی اڑان لی اور اڑ کر اسی طرف چلا گیا جدھر پہلا گیا تھا۔

یہ دیکھ کر جانے کیا ہوا کہ اس نے اپنے تمام جوڑوں میں شدید درد کی ٹیس اٹھتی محسوس کی۔ درد کی شدت سے وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ اس نے بڑی مشکل سے کمپاؤنڈ سے کمرے تک کا فاصلہ طے کیا اور دیواروں کو پکڑ پکڑ کر اپنے بستر کی طرف جانا چاہا لیکن نہ جانے کیوں اس کے جسم نے گھسٹنے سے بھی انکار کر دیا۔ وہ مسلسل کراہ رہا تھا اور قوتِ پرواز سے محروم چڑا بھی چوں چوں کیے جا رہا تھا۔ آم کے درخت میں مکڑی کے جالے سے لٹکا ہوا وہ خزاں رسیدہ خشک پتا بھی بڑی بے بسی سے جیسے خلا میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ گرم ہوا کے تھپیڑوں سے ٹیبل پر رکھے ہوئے اس کے بیٹوں کے تازہ آئے ہوئے خطوط بکھر کر دور جا پڑے تھے۔ وہ انہیں پکڑنے کے لیے پوری قوت سے جھپٹا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑا۔

ڈوبتی ہوئی پہچان

شہر کا یہ علاقہ جو کسی زمانے میں شہر سے دور ایک متمول بستی ہوا کرتا تھا اب بڑھتی ہوئی آبادی کے ریلے نے اسے اپنے وسط میں لے لیا تھا۔ فلیٹوں کے اس جنگل میں وکٹورین طرز کے اس واحد مکان کی بوڑھی مالکہ کو ٹھیکیداروں نے فروخت کرنے کے لیے بڑی بڑی پیشکشیں کی تھیں مگر وہ کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ یہ طویل وعریض مکان کئی حصوں میں کرائے پر اُٹھا ہوا تھا جس کی نچلی منزل کے اگلے حصے میں لان کے سامنے والے کمرے میں وہ اپنی بلی کے ساتھ رہتی تھی۔ گھر کا پچھلا حصہ جو اس کے کمرے سے متصل تھا اُسے اس نے خاتون کے خاندان کو دے دیا تھا۔ اور وہی اُس کی اور اس کی بلی کی خدمت گزاری کا ذریعہ تھی۔ بستر سے لگی گھنٹی کا سوئچ دونوں کے درمیان مواصلات کا ذریعہ تھا اور گھنٹی کی آواز پر آ کر خبر لینا خاتون کے فرائض میں شامل تھا۔

ورانڈے سے نیچے لان میں یوکیریا کے درخت پگوڈا کی طرح کھڑے تھے اور درمیان میں اشوک کا گھنا گھنیر ادرخت دور تک اپنی جڑیں زمین میں جمائے مضبوطی سے کھڑا تھا۔ بہت پہلے اس لان کی دیکھ بھال مالی کے ساتھ مل کر وہ خود کیا کرتی تھیں۔ پینزی، زینیا، اور ہولی ہوپ کے علاوہ گرمیوں میں بیلے اور سردیوں میں گیندے اور گلاب سے ان کا لان گلرنگ اور معطر رہا کرتا تھا۔ گھاس بھی پابندی سے کٹتی تھی اور سیرابی بھی ہوتی تھی۔ کھڑکیوں پر سوکھی ہوئی بلیو بیل اور آئی وی کی گھنی بیلیں کبھی پھولوں پتوں سے بھری رہتیں جن میں شکر خورے گھونسلے بناتے تھے۔ یہ تب کی بات ہے جب بڑی بی کے ہاتھوں میں دم تھا لیکن گٹھیا کی تکلیف نے اب آہستہ آہستہ انہیں اتنا معذور کر دیا تھا کہ چھڑی کا سہارا لے کر وہ گرمیوں میں ہوا اور سردیوں میں دھوپ کے لیے ورانڈے میں پڑی اپنی راکنگ چیئر پر آبیٹھتیں۔

اُس وقت ان کی بلی بھی حسب دستور ان کے پیروں کے پاس بیٹھی ہوتی۔ دونوں دیر تک ویران لان کو تکتی رہتیں جہاں پہلے گھاس اُگتی تھی اور اب خاک اُڑ رہی تھی۔ اس معمول کو گزرے بھی ایک عرصہ ہو گیا۔ اب تو مرض کی شدت نے دونوں کو کمرے ہی تک محدود کر دیا تھا۔ زندگی جیسے گھسٹتی جا رہی تھی۔ باہر کی دنیا سے کٹ کر موسم کے بدلنے کا اندازہ صرف جسم کا بیرومیٹر کر لیتا تھا۔ ہڈیوں پر جھولتی کھال کے اندر درد کا احساس جگانے والی ہوا سرما کی آمد کی خبر دیتی تھی تو حبس اور گھٹن کے احساس سے اے سی کا سوئچ آن کرنے کی ضرورت گرمی کا پتہ دیتی۔ کھڑکی کے پاس اشوک کے پتوں پر ٹپ ٹپ کی آواز سے وہ برسات کا تصور کر لیتی تھیں۔ گھر سے باہر باغ کے دھلے پتوں کی ہری بھری چمچماہٹ اور آسمان پر کالے بادلوں کے پس منظر میں اڑتے سفید، بگلوں کی قطاریں دیکھنے کی نہ بصارت تھی اور نہ ٹانگوں میں اتنا دم۔ سامنے ٹیبل پر رکھے ٹیلی وژن کے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبانے کی ہمت نہ پڑتی کہ اس میں نظر آنے والے کردار اور ان کے رویے اس کے لیے اجنبی اور اکتا دینے والے ہوتے۔ پھر دھندلائی آنکھوں پر زور دینے سے آنکھیں بھی دُکھنے لگ جاتیں۔ محرم اور دمساز بس ایک

پوسی تھی جس کی رفاقت میں زندگی کی آخری منزلیں طے ہو رہی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں کے پیچھے، دھند سے پرے ان کے مشترک ماضی کی طویل کہانی تھی۔

یہ کہانی دراصل پوسی کی ماں لوسی سے شروع ہوتی تھی جس کے ساتھ مینا نے جواب مسز یاور تھیں زندگی کا سفر شروع کیا تھا۔ لوسی بھی بڑی بانکی اور طرح دار بلی تھی۔ اصل نسل کی سیامی، جو دیکھتا لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ امی کی بڑی لاڈلی تھی اور کیوں نہ ہوتی کیونکہ وہ ان کی دیرینہ آرزو تھی۔ پاپا اسے مشرق بعید کے کسی ملک کے دورے سے واپسی پر اپنے ساتھ لائے تھے اور بڑے چاؤ سے اسے امی کی سالگرہ پر سرپرائز کے طور پر پیش کیا تھا۔ امی یہ نایاب تحفہ پا کر پھولے نہ سمائی تھیں اور بڑے فخر سے ہر ایک کو دکھایا تھا۔

ممی اور پاپا کے بقول وہ خود اس وقت چار ماہ دس دن کی گول گپا سی ایرانی بلی لگتی تھی۔ ممی اور پاپا کی لاڈلی پہلی پہلی اولاد تھی۔ امی جب اسے گود میں لیتیں تو لوسی بھی اپنے پنجے ان کے زانوں پر رکھ کر برابر میں خرخرایا کرتی۔ شروع شروع میں دادا اور بوا نے بلی اور بچی کے اس قرب پر بڑی ہائے توبہ مچائی لیکن لوسی بچی سے کچھ اس طرح مانوس ہوئی کہ جیسے اس کی نگراں ہی بن گئی۔ بچی روئی نہیں کہ اس کے کان کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے وہ خود اس کے پاس جا پہنچتی۔ اپنی خرخراتی ہوئی میاؤں میاؤں سے اسے تسلی دیتی۔ رات کو اپنے آرام دہ بستر کو چھوڑ کر بچی کے کمرے کے دروازے پر سویا کرتی کیونکہ اندر جانے کی اسے اجازت نہ تھی۔ اکیلی بچی سوتے میں کہیں چونک کر روئی نہیں کہ لوسی میاؤں میاؤں کر کے گھر کے کسی نہ کسی فرد کو اپنے پنجوں سے ہلکے ہلکے نوچ کر کمرے کی طرف دوڑتی۔ گویا چلنے کا اشارہ کر رہی ہو اور جب تک کوئی بچی کی خبر نہ لے اس کی یہ حرکت جاری رہتی۔

اس کے باوجود دادی اور بُوا ہر روز لوسی کو کہیں پھنکوا دینے کے منصوبے بناتی رہتیں کیونکہ بچی بلی کو اپنے ہاتھوں سے نوچتی کھسوٹتی اور کھلونے کی طرح اس سے کھیلتی تھی۔ کبھی دُم کھینچتی کبھی کان۔

''کل کلاں کو اگر بلی جھپٹ لے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ جانور ذات کا بھلا کیا بھروسہ؟''

بوا بڑبڑاتیں اور دادی اس کی ہاں میں ہاں ملاتیں۔ کبھی بلی کے روئیں سے ڈپتھیر یا جیسے موذی مرض کے ہونے کے اندیشے سے گالوں پر تھپڑ مار کر اللہ سے پناہ مانگی جاتی۔

ان اندیشوں سے پاپا اور ممی کو قائل کرنے کی مسلسل کوششیں ہو ہی رہی تھیں کہ ان ہی دنوں گھر میں کچھ رشتہ دار مہمان مع بچوں کے قیام پذیر ہوئے۔ ہر آدمی بچی کو گود میں لیے لیے پھرنے لگا۔ بچی کے سونے جاگنے کا سارا معمول ہی بگڑ گیا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد بچی کی نیند کم ہوئی۔ کچھ وزن بھی کم محسوس ہوا۔ اور جب ڈاکٹر کو دکھایا گیا تو اس نے بچی کا وقت پر سونا ضروری قرار دیتے ہوئے اس کی ضد اور رونے دھونے کی پروانہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اور بچی سونے کی بجائے گود میں کھیلنے پر مُصر۔ گھر والوں کے لیے اس مشورے پر عمل کرنا مشکل ہو گیا۔

ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے بچی کو بے بی کوٹ میں ڈال دیا گیا اور دروازہ بند کر دیا گیا۔ ماں نے گھر والوں کو بچی کی صحت اور زندگی کا واسطہ دے کر ''دل کڑا کرنے'' کی ہدایت دی۔ بچی نے وہ چیخ و پکار مچائی کہ گھر سر پر اٹھا لیا۔ لیکن کمرے کے باہر تمام افراد کلیجہ تھامے سنتے رہے۔ چائلڈ اسپیشلسٹ کا بھی یہی مشورہ تھا کہ بچی کے رونے دھونے کی پروانہ کی جائے۔ وہ خود تھک کر سو جائے گی۔ لیکن اس صورت حال کو برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا، کمرے کے باہر ماں باپ سمیت سارا گھر دم بخود بچی کے چپ ہونے کا انتظار کرتا رہتا۔

لیکن لوسی ...... اسے چین کہاں۔ وہ کبھی بچی کے کوٹ (Cot) پر اپنے اگلے دونوں پنجے رکھ کر گویا اسے دلاسہ دے۔ کبھی ماں، دادی اور بوا کے قدموں میں لوٹ کر میاؤں

میاؤں کی رٹ لگائے۔ دوڑ دوڑ کر بچی کے پاس جائے اور وہاں سے پلٹ کر گھر والوں کی طرف آئے جیسے التجا کر رہی ہو کہ بچی کو گود میں لے لو۔ لیکن سب دل تھامے گھڑی پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ بیس پچیس منٹ صبر کریں۔ ادھر بچی کی چیخیں کلیجہ شق کیے دے رہی تھیں۔ لوسی بھی سب کے پیروں میں سر رگڑ رگڑ کر خوشامد کرنے کے بعد مایوس ہو کر بچی کے پاس چلی گئی۔ بچی جو پہلے ہی تھک کر چُور ہو چکی تھی لوسی کے قرب کو غنیمت جان کر خاموش ہوگئی اور اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہوگئیں۔ اور پھر یہ تماشا بھی باری باری سے گھر کے سب لوگوں نے دیکھا کہ بلی بچی کے برابر لیٹی ہے اور بچی بلی پر اپنے بازو پھیلائے سو رہی ہے۔ ننھی ننھی ہچکیوں کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔

دادی اور بوا نے اپنے آنسو پونچھے۔ ممی پاپا نے سکھ کا سانس لیا۔ دو راتوں کے اس ڈرامے کے بعد تیسری رات سے بچی واقعی خود بخود اپنے وقت پر سونے کی عادی ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد سے بوا اور دادی دونوں ہی لوسی کی گرویدہ ہوگئیں۔ اس کے بعد لوسی بوا کے اون کے گولے کو کھیل کھیل کر الجھا دیتی اور دادی اماں کی ایزی چیئر پر بیٹھ کر اپنی صفائی کرتے ہوئے اپنے بالوں کو بکھیر دیتی تب بھی بوا اور دادی کو اس پر پیار ہی آتا۔ اگر کوئی ٹوکتا تو کہتیں:

''اے بی، سنا نہیں کہ مجنوں کو لیلیٰ کا کتا بھی پیارا ہوتا ہے۔''

اپنے حسابوں وہ بڑا منطقی جواب دیتیں۔ اکثر لوسی اور مینا کو کھیلتے محبت پاش نظروں سے دیکھتیں۔ حد تو یہ کہ لوسی کے لیے بھی کرن لگی ایک چھوٹی سی پٹاپٹ گوٹ کی مخملیں رضائی سی گئی اور اس کے بستر کو مینا کے کمرے میں لگانے کی بھی اجازت مل گئی۔ تب سے مینا کی نگہبانی کے فرائض باقاعدہ طور پر لوسی کو سونپ دیے گئے۔

گھر میں مینا کے بعد منا بھیا اور منّی بہن بھی آئے لیکن لوسی صرف اور صرف مینا کی ہو رہی۔ اس عرصے میں لوسی نے بھی کئی بار بچے دیے لیکن دادی کے بقول سب کے سب

بدنسلے اور چھچھورے ہوتے۔ اس سلسلے میں لوسی کے ذوقِ انتخاب پر سارے بزرگوں کو اعتراض تھا۔ بچے ذرا بڑے ہوئے نہیں کہ انہیں قصائی کی دکان پر چھڑوا دیا جاتا۔

سب کو فکر تھی کہ کوئی بچہ ماں کی طرح ہو تو رکھ لیا جائے کیونکہ لوسی کی عمر بھی بڑھتی جارہی تھی اور مینا بھی اب اسکول جانے لگی تھی۔ اور ایک بلی بہرحال گھر کی ضرورت تھی کیونکہ اس کے بغیر بچے لنڈورے سے لگتے تھے۔ اور یوں بھی دادی کے بقول ''بلی کتے بچوں کی بلائیں اپنے اوپر لے لیتے ہیں۔'' اسکول کے ساتھ ہی معمول اور پابندیوں کا جال بہت دھیرے دھیرے مینا کو اپنے حلقے میں لیتا جارہا تھا۔ جیسا کہ ہر بچے کے ساتھ ہوتا ہے۔ گھر کی ناز برداریوں کے ساتھ اسکول کے اوقات کار، کلاس میں بیٹھنے کا جبر، اجنبی، مہربان اور نامہربان چہروں سے آشنائی۔ انہیں گوارا کرنا اور آخرکار اسے زندگی کا لازمہ سمجھ کر مصالحت کرلینا اور پھر ان سب کو انجوائے کرنا۔ یہ وہ تربیت تھی جس نے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ یوں معمولات کے ساتھ وقت آگے بڑھتا جارہا تھا۔ چھوٹی موٹی ہلچل کے ساتھ زندگی ایک ڈگر پر چلتی جارہی تھی کہ ایک دن اسکول سے واپسی پر اسے گھر میں کچھ ہلچل سی نظر آئی۔ ہر شخص پُرجوش ہورہا تھا۔ معلوم ہوا کہ لوسی نے دو بچے دیے ہیں جن میں سے ایک ہوبہو ماں پر گیا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔

وہ دوڑ کر اسٹور میں گئی جہاں لوسی کا زچہ خانہ تھا۔ وہاں ٹوکری میں Peach اور چاکلیٹ کلر کا پیارا سا بلونگڑا اور دوسرے ننھے کلوٹے بلونگڑے کے ساتھ گڈمڈ ہورہا تھا۔ اس نے بلونگڑوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دادی، بوا اور امی نے ایک ساتھ چیخ ماری۔

''اے ہے کیا کررہی ہو کاٹ کھائے گی۔''

حقیقت بھی یہ تھی کہ بلی بچہ پیدا کر کے اتنی خونخوار ہوجاتی ہے کہ بچوں کے چھونے کا ارادہ کرتے ہی غرا کر جھپٹتی ہے۔ مگر یہ دیکھ کر سب حیرت زدہ رہ گئے کہ بلونگڑا مینا کے ہاتھوں میں تھا اور لوسی اس کا ہاتھ چاٹ رہی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ فخر و ممنوعیت سے منہ اٹھا کر اسے

دیکھ بھی رہی تھی۔ یہ گویا لوسی اور اس کے درمیان ایک معاہدہ تھا کہ یہ بچہ اس کا ہے اور آنکھیں کھلتے ہی وہ اس کی گود میں سما گیا۔

اور پھر یہ تو معمول ہو گیا کہ جب تک وہ اسکول میں ہوتی بچہ لوسی کے پاس ہوتا۔ وہ خود بھی اسکول میں بلونگڑے کے لیے کھوئی کھوئی سی رہتی۔ بے قرار اسکول سے واپس آتی تو گیٹ پر اسے اپنا منتظر پاتی۔ بس کی آواز سنتے ہی دوڑ کر باہر آجاتا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر سر اس کے پاؤں پر رگڑ رگڑ کر پیار کا مطالبہ کرتا۔ جب تک اسکول کی یونیفارم تبدیل کرنے کے لیے ڈانٹ نہیں پڑتی، دونوں لاڈ پیار کرتی رہتیں۔ اسکول میں ہونے والی ہر بات پوسی کی بتائی جاتی (اس کا نام پوسی اس نے خود رکھا تھا)۔ پوسی بھی بڑی توجہ اور چاہت سے نہ صرف سب کچھ سنتی بلکہ اپنی خُر خُر اور میاؤں میاؤں سے تائید بھی کرتی۔ کم از کم مینا یہی سمجھتی تھی کہ پوسی اُس کی باتیں سمجھتی اور جواب بھی دیتی ہے۔

عمر کے ساتھ ساتھ دونوں کی دوستی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جہاں جاتی پوسی اس کی گود میں ہوتی۔ گاڑی میں ہوتی تو گود میں بیٹھی گردن اٹھائے محو نظارہ ہوتی۔

بچوں کے ساتھ لان میں کھیلتے ہوئے وہ دوڑ لگا کر قریب ہی کسی درخت کی جڑ پر بیٹھ جاتی لیکن اس کی نظریں مینا کے دوڑتے بھاگتے پیروں پر ہی مرکوز رہتیں۔ کبھی وہ خود کھیل کے موڈ میں اچھل اچھل کر گھاس پر ٹڈے اور جھاڑیوں پر سے تتلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کرتی اور کبھی کسی چڑیا کی تاک میں بیٹھتی اور عین اس وقت جب وہ چڑیا کو دبوچنا چاہتی وہ اڑ جاتی اور وہ کھسیانی ہو کر کسی کھمبے کی بجائے اس درخت کے تنے کو نوچتی جس پر وہ شریر چڑیا بیٹھ کر چہچہا رہی تھی۔ بچے اس کی اس حرکت کا مزا لیتے۔ کھیل کے دوران اگر مینا کی کسی سے لڑائی ہو جاتی تو پوسی اپنی تمام امن پسندی کو بالائے طاق رکھ کر مخالف کی طرف پھنکار کر جھپٹتی اور اتنی خونخوار لگتی کہ بچے ڈر کر بھاگ جاتے۔ وہ خود بھی پوسی کی پوری حفاظت کرتی اور بھائی بہنوں کو ہمیشہ دھمکاتی کہ خبردار جو میری پوسی کو مارا۔

ایک دن اسکول میں ٹیچر نے اسے My Pet پر مضمون لکھنے کو دیا تو اس نے اپنی پوسی کی وہ قصیدہ خوانی کی کہ ٹیچر نے جذبات وتخیل سے بھرپور اس کا مضمون بے حد پسند کیا اور اس کے خاص خاص جملے پڑھ کر سب کو سنائے۔

''میری پالتو بلی پوسی کا رنگ چاکلیٹ ملک شیک جیسا ہے جس پر چاکلیٹ کا اسپرے بھی کیا ہوا ہے۔''

''اس کی آنکھیں دادی اماں کے ٹاپس کی طرح اندھیرے میں چمکتی ہیں اور ہری، نیلی اور کبھی براؤن ہو جاتی ہیں۔''

''اس کی موٹی سی دُم امی کے کوٹ کے کالر کے فَر کی طرح نرم اور گدگدی سی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

ٹیچر نے اس کے محدود تخیل اور تشبیہات کو خوب سراہا لیکن اس کے باوجود پوسی کو اپنے ساتھ اسکول لانے کی اجازت پھر بھی نہ دی اور اس کی دیرینہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

لوسی تو جیسے اپنا بلونگڑا اس کے حوالے کر کے بے نیاز ہو چکی تھی۔ اب اس کا کھانا پینا، رہنا سہنا، سب مینا ہی کے ساتھ تھا۔ دونوں ساتھ کھانا شروع کرتیں۔ کیا مجال کہ اس کے نوالہ اٹھائے بغیر پوسی اپنے کھانے کو سونگھ بھی لے۔ کھانے کی میز کے قریب ہی کونے میں پوسی کے لیے Cat food اس کے مخصوص برتن میں ڈال دیا جاتا۔ دونوں کھانا ختم کر کے ساتھ ہی کمرے میں جاتیں اور پوسی اس کے پیچھے پیچھے پھرا کرتی۔ وہ بیٹھی ہوتی تو گود میں خرخرایا کرتی۔ پوسی کے گلے میں دادی اماں نے مخمل کا جو پٹہ لگایا تھا اس میں سنہرے گھنگھرو بھی ٹانک دیے تھے جس کی مترنم چھن چھن سے اس کے وجود کا پتہ لگتا تھا۔ خصوصاً جب وہ ہوم ورک کرنے بیٹھتی تو خوشی سے کبھی وہ میز پر اس کی کاپیوں کو اپنے پنجوں سے ہلکے ہلکے چھیڑتی، کبھی میز کے کونے پر بیٹھی ہی بیٹھی اس کے ہاتھوں پر پنجے مارتی، کبھی نیچے اتر کر اس کے پیروں سے اٹھکھیلیاں کرتی تو گھنگھرو کی چھن چھن اسے بہت اچھی لگتی۔ اور وہ اسے پیار سے اٹھا کر اپنی

گود میں بٹھالیتی۔ اوراس دن کی تمام باتیں، اسکول سے لے کر گھر تک کی تمام باتیں، تمام شکوے پوسی کے گوش گزار کرتی اور پوسی کبھی ہلکی سی میاؤں سے کبھی گردن ہلا کراس کی تائید یا تردید کردیتی۔ ایک دوسرے کی مزاج شناسی نے دونوں کو زبان شناس بھی بنادیا تھا۔ جولوگ اسے ناپسند تھے لوسی بھی ان سے نفرت کرتی اور جنہیں وہ چاہتی پوسی بھی ان سے پیار کرتی۔

سکون و عافیت کے ماہ وسال تیزی سے گزر رہے تھے۔ زندگی پیروں تلے چلنے والے اسکیلیٹر کی طرح قدم اٹھائے بغیر آپ ہی آپ آگے بڑھتی جارہی تھی۔ ہر دور پیچھے چھوٹتا جارہا تھا۔ کتنے ہی موسم آئے اور بہار کے بادلوں کی طرح نیلے آسمان پر تیرتے ہوئے گزر گئے۔ ہر موسم اس کے رگ و پے میں ایک سنسناہٹ چھوڑ جاتا۔ پھولوں سے لدے درخت اور پودوں پر شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹیں، کالی پیلی تتلیوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹیں، ہری گھاس پر بے آواز اچھلتے ٹڈوں کی آوازیں سرگوشی کرتی محسوس ہوتیں اور وہ خود تتلی کی طرح ان کے ساتھ اڑتی ہوئی محسوس کرتی۔ گزرتے موسموں کی مدھم آوازیں جیسے اس کے وجود میں جذب ہوتی جارہی تھیں اور وہ دیر تک اپنے آپ کو ڈھونڈتی رہتی۔ ان ہی دنوں پوسی نے کن کٹے بلے سے دوستی کرلی تھی اور لان پراس کے ساتھ بے فکری سے اٹھکھیلیاں کرتی نظر آتی۔

اور جب وہ اسکیلیٹر سے اتری تو پلیٹ فارم بدل چکا تھا۔ اور وہ دوسرے پلیٹ فارم سے زندگی کا سفر شروع کررہی تھی۔ بہت سارا وقت اور بہت سارے اچھے برے لوگ پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ البتہ پوسی بھی اس کے ساتھ نئی جگہ آ گئی تھی۔ دونوں ہی نئی جگہ پر حیران حیران تھیں۔ پوسی کی آنکھوں میں طمانیت کے بجائے وحشت تھی لیکن دونوں نے حسب دستور ایک دوسرے سے مکالمے کے بعد زبانِ خامشی میں ایک دوسرے کو تسلیاں دیں اور حالات سے سمجھوتہ کرلیا اور نئے ماحول میں اپنے لیے جگہ بنانے میں کامیابی حاصل کرلی۔

پوسی کی سجی سجائی ٹوکری جس میں اس کا بستر تھا جہیز کی آرائشی چیزوں میں اس کے

ساتھ آئی تھی اسے بیڈروم کی کھڑکی کے پاس ایک خوبصورت میز پر سجا دیا گیا تھا تا کہ وہ آزادی کے ساتھ باہر آ جا سکے۔ جبکہ مینا کے لیے آزادی ختم ہو چکی تھی۔ تتلی کے پَر ٹوٹ چکے تھے اور وہ اڑنے کی صلاحیت کھو چکی تھی۔ پوسی کا کن کٹا بلا بھی اس سے بچھڑ چکا تھا اور من مندر کا سنگھاسن ویران ہو چکا تھا۔ دونوں کو اجنبی ماحول میں دل لگانا تھا۔ پوسی نے تو جلد ہی ''تو نہیں اور سہی'' پر عمل کرتے ہوئے لان سے پرے جنگل میں گھومتے بھورے بلے کی پکار پر آخر کار لبیک کہا اور اس نے بھی جواب مینا سے مسز یاور بن چکی تھی اپنے نئے شریک زندگی کو قبول کر لیا تھا۔ ملکیت اور تحفظ کے احساس نے اسے سہارا دیا تھا اور پھر ممتا کی آفاقیت نے اس عہد کو مستحکم کیا۔ یوں نئے گھر کو اس نے اپنے لیے سازگار بنا لیا۔

اور پوسی بھورے سے دل لگا کر بچے پیدا کرنے اور پالنے میں منہمک ہو گئی۔ بچے آنکھیں کھولتے ہی تربیت کے مرحلے میں آ جاتے۔ جب دیکھو فرش پر لیٹی اپنی دُم ہلاتی رہتی اور بلونگڑے اس کی دُم کو پکڑنے کے لیے تاک لگا کر اچھلتے کودتے۔ کبھی دُم پر ٹوٹ پڑتے اور جوش میں آ کر ننھے دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کرتے۔ ایسے موقعوں پر کبھی تو پوسی مصنوعی غصے سے غرا کر ڈانٹتی، کبھی انہیں پیار سے بازوؤں میں دبوچ کر چاٹنے لگتی۔ کبھی لان میں لے جا کر شکار کھیلنا اور دشمنوں سے بچنے کی گھاتیں سکھاتی۔

ان بچوں کا سب سے بڑا دشمن بھورا تھا جسے بچوں میں پوسی کا انہماک ایک آنکھ نہ بھاتا۔ وہ انہیں ختم کرنے کے درپے رہتا کہ یہ اس کی جبلت تھی جو شیر سے اسے ورثے میں ملی تھی۔ اکثر بچے اس کی رقابت کی بھینٹ چڑھ جاتے۔ جو بچتے وہ لوگوں میں بٹ جاتے۔ یوں پوسی فارغ ہو کر کچھ عرصہ غم و غصے میں گزارتی اور پھر بھورے کی پکار پر اس کے کان کھڑے ہونے لگ جاتے اور تھوڑی سی ردو کد کے بعد تعلقات پھر استوار ہو جاتے۔

پوسی کی محبت اور رفاقت کا یہ انداز اسے ہمیشہ زہر لگتا۔ لیکن اب اُسے یہ سب سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کیونکہ خود اس کے یہاں بچوں کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا اور ہر دو

سال بعد خاور، طیب اور طاہر پیدا ہوتے چلے گئے۔ اور وہ خود بھی پوسی کی طرح بچوں کی پرورش میں الجھ گئی۔ پھر تو تعلیم و تربیت کے بکھیڑے بڑھتے ہی چلے گئے۔ ایک مرحلہ ختم ہوتا تو دوسرا مشکل تر مرحلہ شروع ہو جاتا۔ اور یوں وقت کو ایسے پَر لگے کہ پلٹ کر اپنے ہی نقوشِ پا دیکھنے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ یہ انداز بھی اسے پوسی ہی نے سکھایا تھا۔ پوسی اب بھی جب وہ سوئٹر بُن رہی ہوتی یا سلائی کر رہی ہوتی یا بچوں کے ساتھ ٹی وی دیکھ رہی ہوتی تو وہ اس کی گود میں آ جاتی اور وہ کام روک کر اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتی۔ پوسی سر اٹھا کر اپنے مخصوص انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھتی اور یوں لگتا جیسے ماضی کسی فلم کی طرح ریوائنڈ ہو کر دونوں کی چشمِ تصور میں در آتا۔ دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنے مشترک ماضی کے خواب دیکھ رہی ہوتیں کہ یکا یک کسی بچے کا کوئی مطالبہ، یاور کی گاڑی کا ہارن یا کچھ اور اسے جھنجھوڑ کر جگا دیتا۔ بکھرے خوابوں کی کسک بچے کی نیکر ڈھونڈنے یا کچن میں کھانا نکلوانے کی مصروفیات میں معدوم ہو جاتی۔ ایسی کتنی ہی ہوئیں، کتنے ہی خواب دل کے کمپیوٹر میں فیڈ ہوتے رہتے۔

چھوٹے بڑے کتنے ہی دکھ سکھ وہ ابھی تک پوسی سے کہتی چلی آ رہی تھی کیونکہ یہ اس کی عادت تھی۔ ایسی باتیں جو وہ کسی اور سے نہیں کہہ سکتی تھی وہ باتیں پوسی بڑی دلجمعی سے سنتی ہی نہیں سمجھتی بھی تھی۔ دل کی آنکھوں اور کانوں کی زبان سے گفتگو کا سلسلہ دونوں کی مجبوری تھی۔ یوں بھی یاور کو دل کی آواز پر کان دھرنے کی نہ فرصت تھی، نہ عادت۔ اس کے ٹائٹ شیڈول میں اس کی کہیں گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ دو اور دو چار کی دنیا کا آدمی تین اور پانچ کے ذکر سے الجھتا تھا۔ کمانے اور خرچ کرنے کی منصوبہ بندی میں اسے مہارت تھی اور ہر شے پر مکمل اختیار رکھنے پر اسے فخر تھا۔ گھر اس کے فلسفے پر چل رہا تھا۔ اپنی خاموش اور فرمانبردار بیوی کی انتظامی صلاحیت کی طرف سے اسے کوئی تردد نہ تھا۔ بچے صحت مند اور تربیت یافتہ تھے۔ وہ خود صرف اس کے حسن کی جزئیات کو سمجھنے اور برتنے کا قائل تھا اور اس سے آگے وہ

وقت کا زیاں سمجھتا تھا۔ بیڈروم سے باہر دونوں کی ملاقات اور بات چیت باقاعدہ کبھی ہوتی ہی نہ تھی۔ ناشتے کی میز پر چند جملوں کے تبادلے سے گھر کے ضروری امور نمٹا دیے جاتے تھے۔ یاور کو اطمینان تھا کہ بیوی کی ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ اِس خوش رنگ پتنگ کو اس نے اونچا اڑا کر ڈھیل پر چھوڑ دیا تھا اور اپنے کنٹرول پر اسے پورا اعتماد تھا۔

لیکن ادھر کچھ عرصے سے وہ اپنے آپ کو مجبور اور بے بس محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے بچے ایک ایک کر کے اس سے علیحدہ کیے جانے کے بعد اقامتی اسکولوں میں داخل کیے جا رہے تھے۔ اس نے یاور سے پہلی بار احتجاج کیا جس کا جواب یاور نے اپنے مخصوص نپے تلے انداز میں دیا تھا۔

''اپنے بچوں کے لیے میرے عزائم کتنے بلند ہیں یہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ان کا عروج میرا خواب ہے۔''

لیکن عروج کا پہلا ہی مرحلہ اتنا کٹھن ہوگا اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اور بعد میں آنے والے سخت مقامات کا اس وقت کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ بچے جب تک اسکول میں تھے وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ چھٹیاں نہ ہوں تو دونوں میاں بیوی اتوار کے دن جا کر مل آتے تھے۔ جدائی کا یہ دورانیہ ان سے ملنے کی تیاریوں میں گزر جاتا۔ ان کے کپڑے، ان کے شوق کے کھانے اور کھیلنے کی چیزوں کی خریداری اور تیاری میں انتظار کی گھڑیاں آسانی سے گزر جاتیں۔ ان سے ملنے کے خوش آئند تصور سے جو سرور اسے حاصل ہوتا وہ بڑا قیمتی ہوتا۔

بچوں کے آتے ہی سارا گھر ان کی زندگی بخش آوازوں سے گونجنے لگتا۔ وہی دھما چوکڑی، بال کی دھم دھم، تیز تیز بولنا، لڑنا جھگڑنا، طرح طرح کی آوازیں نکالنا۔ ان کے چلے جانے کے بعد بے کراں سناٹے میں بھی ان کی بازگشت سنائی دیتی۔ اور اسے خود اپنا وجود ڈھنڈار سا لگتا۔ یوں جیسے اس کی روح بھی بچوں کے ساتھ ہی چلی گئی ہو۔ سناٹے اور تنہائی کے ان لمحوں میں پوسی گویا اسے تسلی دینے اس کی گود میں آ بیٹھتی اور وہ دیر تک اس سے بچوں کی

ہو باتیں کر کے زندہ رہنے کا احساس دلاتی۔ ہر بار یہی معمول ہوتا اور ماہ وسال گزرتے چلے جاتے۔

لان میں لگے یوکیرا کے پودوں کی طرح اس کے بچوں نے بھی اب اونچے لمبے قد نکالے تھے۔ اپنے چمکتے دمکتے چہرے لیے یہ جب گھر آتے تو جیسے ہر طرف چراغاں سا ہو جاتا۔ ایک جشن سا برپا ہو جاتا اور وہ اپنے وجود کے اندر سے طاقت، مسرت اور طمانیت کا چشمہ سا پھوٹتے محسوس کرتی۔ بچوں کے کھانے، ان کے دوستوں کی مدارتوں کے اہتمام میں وہ خود اُڑی اُڑی پھرتی۔ لیکن بہار کے جھونکے کی طرح یہ وقت بھی گزر جاتا اور 'وہ اگلا موڑ جدائی کا' سر پر آن کھڑا ہوتا۔ یوں بھی گزرتی تو غنیمت تھا لیکن آمد ورفت کا سلسلہ بھی طویل نہ رہا۔

اور پھر ایسے ہی ایک ہنگام جشن کے بعد وہ مرگ آور لمحات شروع ہوئے جب اسے بتایا گیا کہ بچوں کو اب اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانا ہے۔ بچے بیرون ملک کی بڑی یونیورسٹیوں میں داخلے سے بے حد خوش تھے۔ یوں بھی دور دور رہ کر ان میں جو بیگانہ وشی پیدا ہوگئی تھی وہ اس کے دل میں ایک مستقل کسک بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن جب دونوں بڑے لڑکے خوشی خوشی رخصت ہوئے تو اس کے دل میں ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔ چھوٹے بیٹے طیب کو سینے سے چمٹا کر دل کی تسلی کا کچھ سامان ہوا ہی تھا کہ اگلے سال سے اس نے بھی اپنی تعلیم ختم کر کے باہر جانے کی ضد کی اور یوں باپ بیٹے نے اس کے احتجاج کی پروا کیے بغیر اسے بھی باہر کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ دلوا دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے جیتے جی اس کے جسم سے بوٹیاں ایک ایک کر کے الگ کر دی گئی ہوں اور وہ محض ایک ڈھانچے کی صورت دونوں ہاتھ پھیلائے ممتا کی بھیک مانگ رہی ہو۔

اس وقت اس نے پہلی بار اس فاصلے کو محسوس کیا جسے یاور کی بیگانگی نے اس کے اندر زہر کی طرح بھر دیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بہت اوپر آخری سیڑھی پر کھڑا نظر

آیا۔ اس کی آنکھوں میں پہلی بار آنسوؤں کی نمی تھی۔ چہرے پر تھکن اور اداسی اور بالوں میں جھلکتی سفیدی اسے دور سے نظر آ رہی تھی۔ اس نے سوچا کاش اس کڑے وقت وہ اس کے دکھ کا ساجھی ہوتا تو بازوؤں کے حلقے شاید فاصلوں کو مٹا دیتے۔ لیکن وہ اس سے بہت دور کھڑا تھا۔ وہ اپنی اس اجنبی سوچ پر چونک پڑی۔ اس دن یہ سارے احساسات کتنے حیران کن تھے۔ وہ اتنی شکستہ دل ہو چکی تھی جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔

ہمیشہ کی طرح اسے اپنا ڈپریشن دور کرنے کے لیے کسی مصروفیت کی ضرورت تھی۔ تب ہی اس نے پوسی کو اپنے پیروں پر سر رگڑ رگڑ کر گود میں لینے کی التجا کرتے محسوس کیا۔ پوسی کو شاید معلوم تھا کہ وہ جن احساسات سے گزر رہی ہے اس میں اسے تسلی دینے اور بات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے پوسی کو اٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اپنے اندر اٹھنے والے صرصر کے جھونکوں کا زہر پوسی کے کان میں انڈیلنے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ پوسی بڑے دکھ سے منہ اٹھائے گویا اس جوئے خوں کو دیکھ رہی تھی جس سے اس کا آنچل بھیگتا جا رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ بڑی آہستگی سے کھڑکی کے پٹ اپنے پنجوں سے کھول دیتی تھی اور یوں باہر سے آنے والے ہوا کے جھونکے اس کے آنچل اور چہرے کو تھپک کر خشک کر دیتے۔

اسی وقت کھڑکی پر چڑھی مارننگ گلوری کی گھنی بیل میں سیٹیاں سی بجاتے پھولوں کے کٹورے میں لمبی چونچ ڈال کر رس چوسنے والے شکر خورے یا آسمان پر دوڑتے بادلوں کے پرے، یا کوئل کی کوک یا درختوں پر پھدکتی چڑیوں کی سرگوشی چوں چوں اسے ایک دم سے ماضی کی طرف کھینچ لے جاتی۔ وہ اور پوسی دونوں اپنے بچپن، جوانی اور اپنے بچھڑنے والے بچوں کے قصے لے بیٹھتیں۔ دونوں کو اپنے بچوں کی ایک ایک ادا، ہر واقعہ، بھولی بھالی شرارتیں، پیدا ہونے سے بچھڑنے تک کے تمام واقعات یاد تھے کیونکہ یہ کیسٹ نہ جانے کتنی بار ری وائنڈ ہو ہو کر ری پلے ہوتے رہے تھے۔

لڑکوں کے رخصت ہوتے ہی سارے کام اور تمام مصروفیات جیسے ختم ہوگئی تھیں۔
اب صرف فون کالز کا انتظار اور ای میل کی مصروفیت رہ گئی تھی۔ صبح سے شام اسی فکر میں صرف ہو جاتے کہ اس وقت وہاں دن کا کیا بجا ہوگا۔ کون لڑکا گھر میں ہوگا، کون باہر ہوگا۔ کون کمپیوٹر پر ای میل وصول کرنے یا بھیجنے میں مصروف ہوگا۔ یہ سلسلہ بھی رفتہ رفتہ کم ہوگیا اور فون کالز صرف روپوں کی ترسیل اور وصولی کی اطلاع کے لیے مخصوص ہوگئیں۔ یوں مختصر دورانیہ کے لیے ان کی آمد کا سلسلہ بھی باری باری سے جاری تھا۔ ہر بار وہ اس سے دور ہوتے ہوئے محسوس ہوتے۔ ویسے بھی شروع ہی سے اقامتی اسکولوں میں رہتے ہوئے ان میں بیگانہ وشی پیدا ہوگئی تھی۔ بیرون ملک رہ کر وہ شاید اپنے ماضی سے رفتہ رفتہ دور ہوگئے اور صرف ایک لاتعلق سا تعلق رہ گیا تھا۔

ہر بار زیادہ باوقار اور زیادہ خوبصورت لگنے والے اس کے اپنے بچے جن کی صورتوں اور عادتوں میں اس کی اپنی شخصیت کی چھاپ تھی۔ اس کے اپنے وجود کے حصے اب اسے کتنے اجنبی لگتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے کیا بات کی جائے۔ چند سرسری اور سطحی سے جملوں کے تبادلوں سے کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔ بس ان کے لمس کا حظ ہی اسے نصیب ہوتا۔ بڑی سردمہری سے یہ لوگ رخصت ہوتے۔ سامان کی ٹرالی دھکیلتے وہ پھاٹک کے اندر جاتے اور وہ باہر اپنے پیاروں کو رخصت کرنے والوں کے سوگوار ہجوم میں کھڑی انہیں حدنظر تک دیکھا کرتی لیکن وہ پلٹ کر ایک بار بھی اس پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہ کرتے۔

کتنے موسم آئے اور گزر گئے۔ درختوں نے اتنی بار چولے بدلے کہ باغ میں درختوں پر کھدے ہوئے ان کے نام بھی اترنے والی چھال کے ساتھ اترتے چلے گئے۔ مارننگ گلوری کے اندر کتنے ہی چونگڑے نکلے اور اڑے۔ کتنی ہی بار بادل منڈلائے اور برس برس کر گزر گئے۔ ہوائیں کتنی ہی بار بہار کا پیغام لائیں مگر وہ ایک شاخِ نہالِ غم۔ آئینے پر پھچھلتی نظر بھی اس پر گزرتی خرابی کی خبر دیتی رہتی تھی لیکن یاور کے بالوں میں جمتی برف اسے

سب سے زیادہ وقت کی سنگینی اور انقلاب زمانہ کی ستم گری کا احساس دلانے لگی تھی۔

طاہر میڈیکل کی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر کے امریکہ کا ایک معروف ڈاکٹر بن چکا تھا۔ خاور نے کمپیوٹر انجینئرنگ کے شعبے میں اپنے کمالات سے لوگوں کو حیران کر دیا تھا۔ طیب جاپان میں کارکی ری کنڈیشننگ کا پلانٹ لگا کر انٹرنیشنل بزنس مین بن چکا تھا۔ ان میں کسی کے پاس اب فون کرنے کی فرصت نہ تھی۔ Lap Top کمپیوٹر اب ہمہ وقت ان کے ساتھ ہوتا لیکن وہ خود اپنے کمپیوٹر پر کوئی ای میل تلاش ہی کرتی رہ جاتی۔ سب کی مقامی بیویاں تھیں اور غیر ملکی بچے۔ اب وہ سب خود کفیل تھے۔ کبھی ویک اینڈز پر مختصر سی ای میل کے ذریعے خیریت معلوم کر لی جاتی۔ پھر ایک طول خاموشی اور جان لیوا سناٹا۔

وہ دیر تک گم سم بیٹھی ان ڈوبتی ابھرتی ہوئی بچوں کی آوازوں کا شمار کیا کرتی جو گھر کے در و دیوار میں رچی ہوئی تھیں۔ آوازوں کے اس شور میں اس کے پگھلتے وجود کو پوسی کی التجائیں تھام لیتی تھیں۔ وہ اپنی میاؤں میاؤں سے گود میں لے کر باتیں کرنے پر اصرار کرتی اور پھر دونوں زبان اور بے زبانی میں باتیں کیے جاتیں۔

''پوسی ہم تو اونچے پہاڑ سے ٹوٹنے والے پتھر ہیں۔ گرتے جانا ہمارا مقدر رہے۔'' وہ پوسی سے کہتی۔ ''یہاں تک کہ ایک دن اس گہری کھائی میں جا گریں گے جہاں سے پھر کسی کو نظر نہیں آئیں گے۔ اسی طرح ٹوٹتے، پھوٹتے، گھستے، رگڑتے چلے جانا ہے۔'

اور پوسی ہلکی سی میاؤں سے گویا اس کی تائید کرتی۔

اور یاور ...... وہ برگد کا تناور درخت اپنی شاخوں سے نکلنے والی جٹاؤں پر اپنی مضبوطی کا انحصار کیے اعتماد سے کھڑا تھا۔ حالانکہ ان جٹاؤں کے زمین سے مل کر اپنا علیحدہ روپ دھارتے ہی جڑیں کھوکھلی ہونی شروع ہوگئی تھیں۔ اب اُس سے بڑے تین مضبوط، ہرے بھرے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ بالآخر ایک دن بڑی خاموشی سے زمین پر آ رہا۔ اس دن نہ کوئی طوفان آیا نہ تیز ہوائیں چلیں۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی کہ یہ چٹان کی طرح ٹھوس

نظر آنے والا شخص تو گلیشئر کی طرح پگھل گیا......اڑانے والے کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور چھوٹ چکی تھی اور وہ ڈگمگاتی، غوطے کھاتی اس پرانے مکان کی پرلی طرف کاٹھ کباڑ میں الجھی پڑی تھی۔ کتنی بار اوس اور بارشوں سے ڈھلتے، دھوپ میں جلتے اب وہ بدرنگ کاغذ کا چیتھڑا ہو چکی تھی اور قمچیوں سے چمٹی پھڑ پھڑاتی رہتی۔

وہ...... مسز مینا یاور اب بھی زندہ ہے کیونکہ پوسی بھی زندہ تھی۔ اس کا آخری اور کمزور سا سہارا۔ یہ دیرینہ رفاقت شاید کچھ دن اور بھی قائم رہتی اگر وہ حادثہ جانکاہ نہ ہوتا۔ ان دنوں سامنے والے پڑوسی کو کتے پالنے کا شوق ہوا تھا۔ پوسی بے چاری اپنی ضرورت سے ہر شام گیٹ سے باہر نکل جاتی۔ کتّے کے خوف سے اس نے اپنا وقت بھی تبدیل کر لیا تھا۔ صبح جب وہ بند ہوتا تو وہ پھاٹک کے نیچے سے چپکے سے نکل جاتی۔ اس دن صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ شام کو بارش کا سلسلہ رکا تو وہ باہر نکلی ہی تھی کہ بھونکتے غراتے کتے نے پیچھا کیا۔ پوسی بھاگتی ہوئی گیٹ میں گھس رہی تھی کہ کتے نے پچھلی ٹانگ دبوچ لی۔ اس کی چیخیں سن کر وہ چھڑی اور دیوار کے سہارے باہر جانے کی کوشش کر رہی تھی کہ چھڑی بارش سے بھیگے ورانڈے کے فرش پر پھسلی اور وہ ایک چیخ کے ساتھ سیڑھی پر گری۔ اتنے میں پوسی بھی کسی طرح اپنی ٹانگ چھڑا کر اندر آ چکی تھی۔ دونوں گھسٹتی ہوئی کمرے کی طرف چلیں۔ اس نے تمام طاقت جمع کر کے بیڈ سے لگی گھنٹی کا سوئچ دبا دیا۔

خاتون بے وقت کی پکار سن کر بھاگتی ہوئی آئی۔ اس وقت تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ہفتوں بعد جب وہ ٹوٹی پھوٹی اور زیادہ معذور سی ہو کر اسپتال سے واپس گھر آئی تو پوسی کی حالت دیکھ کر اس کی رہی سہی قوت بھی جواب دے گئی۔ پوسی ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ اسے دیکھ کر حسب عادت سر رگڑنے اور پیار کرنے کے پُر جوش اظہار کی قوت بھی اس میں نہ رہی تھی۔ وہ خود بھی درد سے نڈھال تھی اور پوسی کو گود میں اٹھا لینے کے لیے اسے اپنی تمام قوت مجتمع کرنی پڑی تھی۔ اپنے سوجے ہوئے گھٹنوں کو ہلانا بھی اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ پوسی کا

زخم ہر تیسرے دن ڈریسنگ کے باوجود گہرا ہی ہوتا جارہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی تکلیف کو بے بسی سے محسوس کرنے پر مجبور تھیں۔ پوسی کو تو مخصوص انداز سے تھپتھپانے اور سر سہلانے سے آرام آجاتا تھا لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ خود پسینے پسینے ہوجاتی تھی۔

ہر قسم کے علاج کے باوجود پوسی کا زخم مندمل ہونے میں نہیں آرہا تھا، ایک دن خاتون یہ خبر لے کر آئیں کہ ڈاکٹر نے اس کے مرض کو لاعلاج قرار دیا ہے۔ اس کی عمر اس قابل نہیں کہ ٹانگ کاٹی جائے۔ اس کو تکلیف سے نجات دلانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے زہر کا انجکشن لگا دیا جائے۔ خاتون نے بہت سنبھل سنبھل کر یہ خبر سنائی تھی لیکن اس کے باوجود مسز یاور کے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے اس ظالمانہ فیصلے پر سخت احتجاج کیا۔ لیکن پوسی اب اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ اس کی کراہیں بھی ایک ہلکی سی غراہٹ میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ کھانا پینا چھوڑے ہوئے کئی دن ہوچکے تھے۔ کبھی کبھی ڈراپر سے دودھ اس کے منہ میں ٹپکا دیا جاتا تو تکلیف کی شدت سے بے قرار ہوجاتی۔ جب وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی، اسے تھپکیاں دیتی تو وہ اپنی نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتی جیسے التجا کررہی ہو کہ کچھ کرو۔ میری تکلیف دور کردو۔ لیکن ڈاکٹر نے اس کو دکھوں سے نجات دلانے کا جو نسخہ تجویز کیا تھا اس کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔

پوسی کی حالت اب دیکھی نہیں جاتی تھی۔ زخم کی ٹیسوں سے جیسے اس کا سارا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ اس کو یوں تڑپتے دیکھنا بھی اب اُس کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔ خاتون اسے پوسی کی اذیت کا احساس دلا کر ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنے کی تلقین کرتی۔ آخر کار اس نے پوسی کو اذیت سے نجات دلانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس فیصلے کے ساتھ اس کا اپنا دل اندر ہی اندر ڈوبنے لگا۔ وہ بے سدھ ہوکر بستر پر گرگئی۔ پوسی کے ساتھ برسوں کی رفاقت یوں ختم ہوگی یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے پوسی کی ٹوکری کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اسے سینے سے لگا کر ایسی باتیں شروع کردیں جیسی بچپن میں اس سے کیا کرتی تھی۔ دونوں درد سے بے حال

تھیں اور پوسی کو تو جواب دینے کا بھی ہوش نہ تھا۔ کوئی ہلکی سی دکھ بھری میاؤں تک نہیں۔

باہر سے آنے والی ہر آہٹ اسے موت کی آہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل جیسے اپنے بوسیدہ پنجرے کو توڑ کر باہر آ جانا چاہتا تھا۔ اس نے بہ دقت رندھے ہوئے گلے سے صرف اتنا کہا:

''پوسی میری جان، مجھے معاف کرنا۔ کیا کروں کہ تمہاری اذیت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی!''

اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس نے پوسی کے سر پر پھیرا اور اس کے دونوں تھرتھراتے پنجوں کو ہاتھ میں لے کر سہلاتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور پوسی کے کافی رنگ جسم کو گیلا کر رہے تھے۔

کھلے دروازے سے خاتون داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے جانوروں کا وہ ڈاکٹر تھا جو برسوں سے پوسی کا معالج رہا تھا۔ پر آج ڈاکٹر کے ہاتھ میں کسی سرخ سیال سے بھری سرنج تھی۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر اس نے پوسی کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اس کا چہرہ اپنے چہرے سے ملا لیا اور پوسی کی ڈوبتی ہوئی سانسیں اسے اپنے چہرے پر محسوس ہوئیں۔ اسے نہیں معلوم کہ ڈاکٹر نے کب پوسی کے جسم میں سوئی داخل کی اور نکالی۔ اس نے جھک کر پوسی کے کان میں کہا۔

''تم خوش قسمت ہو کہ دکھوں سے نجات پا گئیں۔ میرے لیے ایسی کوئی دوا نہیں۔''

اس کے ساتھ ہی پوسی کا موت سے لڑتا ہوا جسم اس کے بازوؤں میں آ رہا۔

☆☆☆

گلدان

مارچ کا مہینہ یوں بھی بڑا خوبصورت اور رومانی ہوتا ہے اور میرے لیے تو یہ اور بھی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ میرے ماضی کی تمام تلخ اور شیریں یادیں اسی موسم بہار سے وابستہ ہیں۔ اس مہینے کے شروع ہوتے ہی تمام بھولی بسری یادیں ہر طرف سے آ کر خود بخود حافظے میں گنگنانے لگتی ہیں اور ذہن میں ہلچل سی مچا جاتی ہیں۔ یوں جیسے بہار کی گرم دوپہر میں ہمارے باغ میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور پھولوں کی خوشبو مل جل کر ایک خواب گیں ماحول پیدا کر دیتی تھیں۔ مارچ کے آخر میں جب درخت اپنا نیا چمکیلا جوڑا پہنتے ہیں اور پھولوں سے ڈھک جاتے ہیں تو میں نیچے گرے ہوئے ان خزاں رسیدہ بھورے پتوں کا نوحہ ہمیشہ نظر انداز کر جاتی ہوں جنہیں آم اور جامن کے بور کی خوشبو سے لدی ہوئی ہوائیں زمین پر ادھر سے ادھر لڑھکاتی پھرتی ہیں۔ بھلا ایسے موسم میں جب فضا چڑیوں کی چہکار اور شہد کی

مکھیوں کے نغمے سے گونج رہی ہو، پھولوں کی ٹھنڈی آگ سے گلشن دہک رہا ہو ہر طرف خوش رنگ تتلیوں کے خوبصورت پُر فضا میں رقص کر رہے ہوں، بہار کے نیلے شفاف آسمان پر بادل کے آوارہ ٹکڑے تیر رہے ہوں تو خزاں رسیدہ پتوں کا نوحۂ الم سننے کی فرصت کوئی کہاں سے لائے؟ یہ سمجھنے کی کوشش کون کرے کہ یہ خزاں رسیدہ پتے جو بہار کی ہوا سے یوں زمین پر بے سہارا لڑھک رہے ہیں کبھی درختوں کی زینت تھے اور گلشن کی تزئین و آرائش میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ ان خزاں رسیدہ پتوں کا مسیحا کوئی نہیں جو اپنی طبعی موت سے پہلے ہی تیز و تند ہواؤں کے جھکولوں سے گر جائیں اور یوں پامال ہوں اور یوں روندے جائیں جیسے کہ وہ درخت میں لگے ہی نہ تھے، جیسے کہ ان کے رنگ و روپ سے کبھی کسی کو فائدہ پہنچا ہی نہ ہو۔

یہی بہار کے دن تھے اور مارچ کا خوشگوار مہینہ جب میں نے پہلی بار راحت کو دیکھا۔ گل عباس کی گھنی جھاڑیوں میں زرد پروں پر چمکیلی سیاہ دھاریوں والی چڑیا کو میں بڑے انہماک سے پ[illegible]تے اور چہچہاتے دیکھ رہی تھی۔ میرے دونوں پاؤں حوض میں تھے اور میرے پیچھے سرخ گلاب ہوا سے جھوم رہے تھے۔ سامنے سفید گلاب کی جھاڑیاں پھولوں سے لدی ہوئی تھیں اور اس پر تتلیاں لہرا لہرا کر اڑ رہی تھیں۔ اوپر نیلے آسمان پر سفید بادل کے ٹکڑے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ امرود اور لیموں کے پھولوں کی باس نشہ سا طاری کر رہی تھی۔ تب ہی مجھے احساس ہوا تھا کہ کوئی مجھے دیکھے جا رہا ہے۔ ان دنوں میرے احساسات کتنے تیز ہو گئے تھے۔ اور جب میں نے پلٹ کر پھاٹک کی طرف دیکھا تو راحت کی نظروں کو اپنی طرف مرکوز پایا۔ اس دیوانہ کر دینے والی فضا نے، ہوا کی عطر بیزی نے، پھولوں اور تتلیوں کے رنگوں نے، چڑیوں اور شہد کی مکھیوں کے ساز نے جانے کون سا سحر کر دیا تھا کہ میں اسے دیکھتی ہی چلی گئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دم میرے دل نے تھوڑی دیر کے لیے جیسے دھڑکنا بند کر دیا ہو۔ شاید یہ فضا کا طلسم تھا کہ وہ بھی مبہوت کھڑا تھا۔ وہ لمحہ کتنا حسین تھا جب ہماری

نظروں کا تصادم زندگی بھر کا سنجوگ بن گیا۔ زندگی کے اس نئے موڑ پر میرا دل انتظار کی اذیت ناک لذت اور نگاہیں دیدار کی مسرت سے آشنا ہوئیں۔ خزاں کے سوکھے زرد پتے تیز و تند ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے جانے کہاں گم ہوگئے۔ ان کے نوحۂ الم کی بازگشت سرسبز فضاؤں میں معدوم ہوگئی۔ میں نے راحت کا زندگی کی حرارت سے بھرپور ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پایا اور زندگی کی بہار اور خزاں اس کے وجود میں سماگئی۔

وہ بھی بہار ہی کے دن تھے جب درخت اپنا پرانا لباس اتار کر نیا اور چمکیلا سبز لباس پہن رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف درخت سرخ و سفید اور فالسئی پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ اس وقت بہار کا سارا حسن میری گود میں سمٹ آیا تھا۔ جہاں نئی زندگی کا چاند مسکرا رہا تھا۔ زندگی کے اس مسرور کن احساس کو آگ اور خون کی وہ آندھیاں بھی ملیامیٹ نہ کرسکیں جو وطن عزیز کی تقسیم کے ساتھ ہی پورے ملک کو جیسے بھسم کردینے پر تُل گئی تھیں۔ بہار نے اس بار نیا روپ دکھایا۔ درختوں کی شاخوں پر لگے ہوئے ان تمام پھلوں، پھولوں اور پتوں کو زبردستی شاخوں سے نوچ کر فضا میں اچھال دیا اور وہ ہوا کے تھپیڑوں سے بے حال ہوکر مختلف سمتوں میں بکھر گئے۔ یہ بھی بہار ہی کا ایک روپ تھا جس میں خشک اور بے رنگ پتوں کے ساتھ سرسبز پتے، نوشگفتہ پھول اور تر و تازہ پھل سب وقت سے پہلے ہی بکھر کر ریزہ ریزہ ہوگئے۔

اور پھر یوں ہوا کہ ہم جو چمن کی تزئین و آرائش میں برابر کے شریک تھے۔ شاخ بریدہ کی مانند سوکھنے لگے۔ بہار کی زندگی بخش ہوا ہمارے لیے بادِ سموم بن گئی۔ ہم ان چند سوکھے تنکوں سے بھی محروم ہوگے، جن کی مدد سے ہم کسی گمنام شاخ کے کسی بے نام سے گوشے میں اپنا آشیانہ تعمیر کرسکتے۔ ہم وہ پرندے بن گئے جو ناسازگار موسم سے بچنے کے لیے سال بھر شمال سے جنوب اور مغرب سے مشرق کی سمت پرواز کرتے رہتے ہیں۔ چمن میں بہار آگئی تھی لیکن اس موسم گل میں میرا کوئی حق نہ تھا، تب ہم نے اپنی وہ دہلیز چھوڑ دی جو ہمارے آباؤ

اجداد نے پشتوں میں بنائی تھی ۔ جہاں کی مٹی ہماری زندگی کا جزو تھی اور جہاں کی مٹی میں دفن ہو کر مٹ جانا ہماری آرزو تھی ۔ لیکن ہم نے اس آرزو کا گلا گھونٹ دیا۔ سب کو چھوڑ کر میں نے منے کو گود میں لیا اور راحت کا ہاتھ پکڑ کر خون سے لت پت گلیوں کو پار کر گئی ۔ جاتے جاتے پلٹ کر میں نے اس گلی کو دیکھا جس کے چپے چپے سے بے شمار تلخ یادیں وابستہ ہیں ۔

اور جب ہم مشرق کی جانب اپنی نئی منزل کو چلے تو ہمارے پاس یقین اور اعتماد کی دولت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم ایک نئے چمن کو اپنے خون پسینے سے سینچنے کا ارمان لے کر روانہ ہوئے جہاں ہم اپنی مرضی کے مطابق کسی ایسی شاخ پر آشیانہ بنائیں گے جس کے تنکے تیز و تند طوفانوں میں بھی منتشر نہ ہوں گے ۔ ہم اپنے چمن کو پھولوں سے بھر دیں گے اور وہ تمام راستے بند کر دیں گے جن سے ہو کر خزاں کے تباہ کن جھونکے داخل ہو سکتے ہوں ۔

ہمارا اپنا گھر ...... ہاں میں اُسے گھر ہی کہوں گی کیونکہ گھر کی مادی آسائشیں نہ سہی روحانی سکون ضرور تھا۔ یہ مال گاڑی کے بے کار ڈبے تھے جن میں ریلوے کے ادنیٰ و اعلیٰ ملازمین کو آباد کر دیا گیا تھا۔ ریلوے یارڈ کے ایک طرف پھیلے ہوئے بے شمار ناکارہ ڈبوں میں ایک دنیا آباد تھی ۔ ان ہی میں ایک ڈبہ ہمارا یعنی راحت صاحب انجینئر کا بھی تھا۔ ریلوے یارڈ کے ایک طرف آم اور کٹھل کے گھنے باغوں کے درمیان جا بجا کیلے اور بانس کے جھنڈ تھے ۔ ان کے درمیان بانس کی چٹائیوں اور پٹ سن کی خشک شاخوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں ہمارے نئے ہم وطن آباد تھے ۔ دوسری طرف دور دور تک دھان کے کھیت تھے جو پانی میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ دن بھر مچھیرے مچھلیاں پکڑتے رہتے ۔ ریلوے یارڈ بلندی پر تھا جس کے چاروں طرف کا منظر بڑا خوبصورت تھا۔ سبزہ ہی سبزہ ، ہریالی ہی ہریالی ۔

وہ صبح کا وقت تھا جب ہم نے اپنے نئے گھر میں قدم رکھا اور دیر تک ماحول کے حُسن میں گم رہے ۔ پانی میں کھلے کنول کی سرخ اور بند کلیوں کے سرے مندر کے کلس کی طرح کھڑے تھے ۔ کہیں کھلے کنول صبح کی صباحت میں اضافہ کر رہے تھے ، دوپہر ہوتے ہوتے یہ

پھر سے منہ بند کلیوں کی شکل اختیار کر کے چوڑے پتوں کے درمیان چھپ جاتے۔ حدِ نظر تک دھان اور پٹ سن کے پودے پانی کی سطح پر لہراتے رہتے۔ ان کے درمیان چھوٹی چھوٹی کشتیاں دور سے کالی چڑیوں کی طرح نظر آتیں۔ سامنے درختوں کے نیچے افسروں اور کلرکوں کو ایک ساتھ ایک جذبے سے کام کرتے دیکھ کر میں دور مستقبل میں گم ہو جاتی جب ان سب کی مشترکہ کوششوں سے ہمارا وطن سر بلند ہوگا۔ اس وقت کرشنا چورا کے سرخ پھولوں سے لدے ہوئے درخت مجھے موسم بہار کا احساس دلاتے۔ بہار جو اب کبھی خزاں کا روپ اختیار نہ کر سکے گی۔

راحت سارا دن شدید محنت کرنے کے بعد رات کو جب پسینے سے تر واپس آتا تو جوتوں سمیت بستر میں پڑ جاتا۔ راتوں کو شدید حبس اور لوہے کی تپتی چھت گرمی سے نڈھال کر دیتی۔ رات کو کسی وقت بارش ہو جاتی تو قدرے سکون ملتا اور گھپ اندھیری رات میں لوہے کی چھت پر بارش کا شور ہمارے لیے لوری کا کام دیتا۔ صبح ہوتے ہی سورج طلوع ہوتا اور ذرا سی دیر میں ہمارا ڈبہ پھر سے تپ جاتا۔ لیکن اس تنور میں زندگی گزارنے کے باوجود ہم پُر امید تھے اور ملک کی تعمیر میں مگن۔

صبح جب مرد اپنے کام پر چلے جاتے تو عورتیں اپنے بچوں کو لے کر درختوں کے جھنڈ میں واقع مقامی آبادی میں چلی جاتیں۔ ہمارے بچے ان کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگ جاتے اور عورتیں آپس میں باتیں کرتیں۔ مچھلی اور کٹھل کی مانوس بو ہر طرف پھیلی ہوتی۔ چاول پک رہے ہوتے اور ہم ایک دوسرے کی زبانیں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے۔ دلوں میں خلوص ہو تو زبان کی اجنبیت بھی اظہار مدعا میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ ٹوٹی پھوٹی زبان کے سہارے دیس دیس سے آنے والوں کے درمیان سماجی ارتباط بڑھتا گیا۔ زبان، معاشرت اور زمین کے رشتوں کے فرق کے باوجود ہم سب ایک غیر محسوس بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ چمن چمن کے پھولوں کا ایک گلدستہ سا بن گیا تھا۔ ہر پھول کا رنگ الگ بو الگ،

مگر مجموعی حسن دلفریب تھا۔ چمن کی آرائش میں کتنے پودے زمین کا اثر قبول کر لیتے ہیں اور ان کی جڑیں دور دور تک پھیل جاتی ہیں لیکن کتنے ہی پودے اجنبی آب وگل کا اثر قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کی جڑیں زمین میں دور دور تک نہیں پھیلتیں وہ گملوں کی محدود وسعتوں میں لہلہاتے ہیں لیکن طوفانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت ان میں نہیں ہوتی۔ مال گاڑی کے ڈبوں کے آہنی فرش پر جنم لینے والے کتنے ہی بچوں نے بنگال کی نرم، گیلی اور خنک مٹی میں ہمیشہ کے لیے چھپ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

قدرتی آفتوں اور صعوبتوں کو برداشت کرتے ہم نے برسوں گزار دیے۔ موسلا دھار بارش میں ٹپکتی ہوئی چھتوں سے کہیں اماں نہیں ملتی۔ یہ سلسلہ کئی کئی دن جاری رہتا اور ہم بھنے ہوئے چاول کھا کھا کر گزارا کرتے۔ بارش میں ایندھن کی گیلی لکڑیوں کے دھوئیں سے ہماری آنکھیں سوج جاتیں۔ اسی طرح دن کٹتے رہے، بہاریں آئیں اور گئیں۔ آم اور کٹھل کے گھنے باغوں میں کوئلیں کوکیں فضا بور کی رسیلی خوشبو سے بوجھل ہوئی، کرشنا چورا پر بہاریں آئیں، پھول کھلے اور مرجھا گئے ...... اس عرصے میں بے شمار عمارتیں زمین سے اُگ آئیں، سرکاری دفاتر اور رہائشی مکانات تعمیر ہوئے، لوگ مال گاڑیوں کے ڈبوں سے اٹھ اٹھ کر ان میں منتقل ہو رہے تھے اور ہمارے پڑوسی ڈبے ویران ہوتے جا رہے تھے۔

مارچ کی ایسی ہی ایک سنہری دوپہر تھی جب میں حد نظر تک پھیلے ہوئے سبز کھیتوں اور دور ندی میں تیرتی ہوئی کشتیوں کے اڑتے ہوئے بادبانوں کو دیکھ رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے دَل منڈلا رہے تھے۔ سرخ کنول سے بھرے تالاب میں تیرتی ہوئی سیاہ سفید بطخوں کا ایک شور سا برپا تھا اور پانی کے گھڑے بھر بھر کر لے جانے والی نازک کمر اور لمبے سیاہ بالوں والی سانولی لڑکیاں بھی اسی منظر کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھیں۔ میرا بیٹا اس وقت پانی کے کنارے گھاس پر اڑنے والی بھنبھیریوں کی دم میں دھاگا باندھ کر انہیں ہوائی جہاز کی طرح اڑانے میں مصروف تھا۔

اسی وقت خلاف معمول میں نے دور سے راحت کو آتے دیکھا۔ ان دنوں اس کا تبادلہ بہت دور دارالحکومت میں ہو گیا تھا اور اسے ایک جیپ بھی مل گئی تھی۔ اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح میرا دل خوشیوں سے بھر گیا۔ اس نے آتے ہی یہ خبر سنائی کہ وہ جس منصوبے پر کام کر رہا تھا وہ مکمل ہو گیا ہے اور اسے بھی ایک مکان مل گیا ہے۔ اس کی باتوں اور اس کے ہر ہر انداز میں آسودگی اور طمانیت تھی۔ یوں جیسے اس نے منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے برسوں دھوپ میں تپ کر بارش اور پسینے میں نہا کر کتنی ہی راتیں گرمی، حبس اور مچھروں کی نذر کر کے، دھوپ میں بھاگ بھاگ کر اپنا رنگ سیاہ نہ کیا ہو بلکہ شاہجہاں کی طرح کسی محل کے جھروکے سے کھڑے ہو کر تاج محل کو اپنے احکامات کے مطابق بنتے دیکھا ہو، میری آنکھوں سے جانے کیوں آنسو ٹپک پڑے، یہ آنسو جو شاید مسرت کے وہ شبنمی قطرے تھے جو بیابانوں میں بھٹکنے والے راہی کی آنکھوں سے منزل پر پہنچ کر ٹپک جاتے ہیں۔ ان آنسوؤں میں بیتے ہوئے دنوں کی اذیتیں تھیں، وہ محرومیاں تھیں جو راحت کی مصروفیتوں اور مشقتوں کے طفیل مجھے ملی تھیں۔

اور تب ہم نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور دنیا کے پہلے انسان کی طرح ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے یوں چل پڑے جیسے ہم مال گاڑی کے ڈبے سے نہیں بلکہ آسمان سے اپنی جنت کی تخلیق کے لیے بھیجے گئے ہوں۔ ہمارا مُنا کبھی کبھی ہم سے ہاتھ چھڑا کر پانی کے کنارے اُگی ہوئی جل کمبی کے نیلے پھول توڑنے لگ جاتا، پھر دوڑ کر ہمارے ساتھ ہو جاتا۔ کبھی وہ خوش رنگ تتلیوں کے پیچھے بھاگتا اور ہم اس کے ہوا سے اڑتے ہوئے گھنگھریالے سنہرے بالوں کو دیکھ کر خوش ہوتے۔

ہمارا اپنا گھر ایسی جگہ تھا جہاں ایک اور دنیا آباد تھی۔ ہر طرف خوبصورت عمارتیں بن گئی تھیں۔ دریاؤں، سبزہ زاروں اور لہلہاتے کھیتوں کے درمیان دیس دیس سے آنے والے عزم و ہمت سے سرشار لوگوں نے دھرتی کی کایا پلٹ دی تھی۔ اپنے مکان کے لان میں

کھڑے ہو کر ہم نے چاروں طرف بکھرے ہوئے گھنے درختوں کو دیکھا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اور اس کے نیچے بنگال کی سیاہ زرخیز مٹی۔ اب یہی مٹی ہماری تھی، یہی ہماری منزل تھی جسے حاصل کرنے کے لیے ہم نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ اسی مٹی میں ہمارے اپنوں کے پسینے، چاند سے بچوں کے معصوم چہرے اور ان کی ماؤں کے آنسو جذب ہو چکے تھے۔ مختلف جگہ سے لائے گئے پودوں نے اس مٹی میں اپنی جڑیں پھیلا دی تھیں۔ تخمی اور قلمی پودے ایک طرح سے لہلہا رہے تھے۔ ہم بے حد خوش تھے کہ گنگا، پدما اور سُرما سے سیراب ہونے والی اس سرزمین پر بہار کے قدم ہمیشہ ہی جمے رہتے تھے۔ کٹھل، جامن اور ناریل کے تناور درخت ہر طرف پاسبانوں کی طرح کھڑے تھے۔

تین کمروں کے کشادہ مکان میں زندگی کا رنگ و روپ بالکل بدل گیا تھا، ضرورت کی تمام چیزیں مہیا تھیں اور عُسرت عشرت میں بدلتی جا رہی تھی۔ ہمارے پڑوسی آسودہ حال لوگ تھے جو اکثر ہمارے گھر آتے اور ہم ان کے یہاں جا کر گھنٹوں باتیں کرتے۔ ہمارے بچے ان کے بچوں سے اور ان کی مائیں ہم سے خوب گھل مل گئیں۔ لیکن راحت جانے کیوں کچھ بجھے بجھے سے رہتے۔ شاید اس لیے کہ اب وہ کئی بچوں کے باپ بن گئے تھے اور ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے اپنی اداسی کا سبب مجھے کبھی نہیں بتایا لیکن میں ان کی دلجوئی کرتی رہی۔

وقت تیزی کے ساتھ گزرتا جا رہا تھا۔ ہمارے بچے جوان اور ہم بوڑھے ہوتے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی راحت کی تشویش کا سبب بھی مجھ پر کھلتا جا رہا تھا۔ بات اب صرف محسوس کرنے کی نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھنے کی تھی۔ ہمارے گلشن کی شادابی اب دشمنوں کو کھٹکنے لگی تھی۔ دیس دیس سے ٹھکرا کر نکالے جانے والوں نے اپنی محنت و مشقت سے جو مثالی گلشن تعمیر کیا تھا، صیاد اس کی گھات میں تھا۔ ہم اپنے آشیانوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں مگن تھے اور سمجھتے تھے کہ ہمارا مضبوط بندھن بڑے سے بڑے ہتھیار سے نہیں کٹ سکتا لیکن چمن کے

مالیوں نے اجنبی سرزمینوں سے لاکر لگائے جانے والے پودوں کی آبیاری ضروری نہیں سمجھی اور ساری توجہ ان پودوں کی آبیاری اور تراش خراش پر صرف کرنے لگے جن کی جڑیں زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں پیوست تھیں۔ تاہم یہ اجنبی پودے صیاد کی گھاتوں اور مالیوں کی بے اعتنائی کے باوجود چمن کی زینت دوبالا کررہے تھے، وہ اپنی جگہ جمے کھڑے تھے اور اپنی نگہداشت خود کررہے تھے۔ شاید ان کے اندر وہ قدرتی نمی اور رس اب بھی موجود تھا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کے سہارے بڑھتے جارہے تھے۔

ہم نے دیکھا کہ دشمنوں نے چمن کی فضاؤں میں زہریلے جراثیم چھوڑ دیے ہیں جو درختوں کی جڑیں کھوکھلی کررہے ہیں۔ پھول اپنی چمک دمک سے محروم ہوتے جارہے ہیں اور پھلوں کی مٹھاس میں کڑواہٹ گھلتی جارہی ہے۔ ان تبدیلیوں کے باوجود ہم مایوس نہیں تھے اور فضاؤں میں گھلنے والے زہر کو اپنے طور پر دور کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ شاید ہم اس کی زہرناکی سے پورے طور پر آگاہ نہ تھے۔ ہم اپنے پڑوسیوں کے گھر جاتے تو چمن میں چلنے والی اس نئی ہوا کے اثرات پر بحث کرتے اور پھر اپنے اپنے کام میں لگ جاتے۔ ہمیں اپنے خلوص نیت پر اعتماد تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا گلشن بادِسموم کے جھونکے برداشت کرے گا اور اس کی شادابی پامال نہ ہوگی۔

لیکن حالات تیزی سے تبدیل ہوتے جارہے تھے۔ فضائیں مسموم ہورہی تھیں، برسوں پہلے قائم ہونے والے محبت اور یگانگت کے رشتوں کو نفرت کے آرے سے کاٹا جارہا تھا، گلشن کے تناور اور ہرے بھرے درختوں کی جڑوں میں محبت کے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی جگہ نفرت کا تیزاب ڈالا جارہا تھا۔ سائے اور آشیاں بندی کے خواہاں پرندے اب ان درختوں کے سائے سے گریزاں تھے جنھوں نے اپنی شادابی اور خوشبو سے ایک دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ انہی دنوں اکتوبر کے مہینے میں ایک بھیانک طوفان آیا۔ طوفان وہاں روزمرہ کا معمول تھے لیکن یہ طوفان اتنا خوفناک تھا جیسے گلشن کا تمام اثاثہ اور امن وسکون لوٹ

لینے پر آمادہ ہو۔ شدید بارش اور خوفناک ہواؤں کی یلغار رات بھر جاری رہی، دھماکے ہوتے رہے، کھڑکیاں دروازے ٹوٹتے رہے اور گھر گرتے رہے۔

صبح ہم لان میں آئے تو میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ طوفان نے بڑے بڑے تناور درختوں اور نئے نویلے پودوں کے ساتھ ایک سا سلوک کیا تھا۔ وہ سب سرنگوں تھے۔ ان کی جڑیں ٹوٹ چکی تھیں۔ میرے بنگلے کے دونوں طرف اونچے اونچے ناریل کے مضبوط درخت جو پاسبانوں کی طرح کھڑے رہتے تھے زمین بوس ہو چکے تھے اور ان کی جڑوں کی جگہ ایک بھیانک غار نظر آ رہا تھا۔ طوفان میں ہمارا سب کچھ غرق ہو چکا تھا۔ خلوص، محبت مروت اور یکجائی کے رشتے بھی سیلاب کی نذر ہو گئے تھے۔ نفرت کی ایسی شدید آگ بھڑک اٹھی تھی جسے پُر شور ندیاں اور آسمان سے ہونے والی شدید بارش بھی بجھا نہ سکی۔ وہ فضائیں جو خوش الحان پرندوں کی چہکار سے گونجا کرتی تھیں مخالفانہ نعروں سے گونج رہی تھیں۔

اور اب سڑکوں پر سے ہر وقت نعرے لگاتے جلوس گزرا کرتے۔ ان نعروں سے ہمیں ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خواب جسے پورا کرنے کے لیے ہم نے اپنی دھرتی سے ناطہ توڑا تھا محض ایک خواب ہی تھا۔ ایک خوشگوار خواب جس کے لیے ہم نے اتنے عرصے تک سختیاں جھیلیں اور اب جب کہ گلشن پھولوں کی باس سے مہک رہا تھا تو نفرت کے جھونکوں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایسا لگتا، جیسے اب گلشن میں ہمارے لیے کوئی جگہ نہ ہو۔ جو لوگ کل تک سراپا نیاز اور ہمارے دکھ سکھ میں شریک تھے، آج ہمارے سائے سے بھی گریزاں تھے۔ ہمیں یہ احساس دلایا جا رہا تھا کہ تم ہم میں سے نہیں ہو۔ تم بھونرے ہو اور ہمارے گلشن کے پھولوں کا رس چوسنے یہاں آ گئے ہو۔ بھونروں کا بھی مقدر۔ جن کے پھولوں کا رس چوسنا سب نے دیکھا لیکن اس رس سے تیار ہونے والے شہد کو کسی جذبۂ تشکر کے بغیر ہضم کر لیے جانے پر کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر، سُن کر ہم صدموں سے نڈھال ہو رہے تھے۔

بہار کا موسم ایک بار پھر آیا۔ درختوں پر نئے چمکدار پتے نکل آئے۔ فضا آم کے بور اور وولن چمپا کی خوشبو سے معطر ہو اٹھی۔ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور کوئلوں کی کوک سنائی دینے لگی۔ لیکن جانے کیوں مسرت اور سرشاری کے اس پُر بہار موسم میں اب کے وہ دلآویزی نہیں تھی۔ اب شام کے وقت سبزہ زاروں میں نکلتے ہمیں خوف آتا تھا۔ راستے کے دکاندار ہمیں عجیب نظروں سے دیکھتے اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کے بچے جو ہمارے گرد جمع ہو جایا کرتے تھے، اب ہمیں دیکھ کر چوکڑیاں بھرنا بھول جاتے۔ کسانوں کے چہرے اب اس مانوس چمک اور شفقت سے عاری ہوتے جو ہمارے بچوں کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ہوتی تھی۔ اب وہ بانس کے پُل پر سے گزرتے وقت ہمارے ڈرتے سہمتے بچوں کو تشویش آمیز شفقت سے نہیں دیکھتے تھے۔ جیسے ہمارے بچوں کو سنبھل کر چلنے کی ہدایت دینا اب ان کا کام نہیں تھا۔ ندی کے کنارے کشتی کے انتظار میں ہم دیر تک کھڑے رہتے اور پہلے کی طرح بے شمار کشتیاں اب ہمیں پار اترنے کی پیشکش نہ کرتیں۔ وہ دور دور سے گزر جاتے جیسے شام کے گہرے اندھیرے میں ڈرتے اور گھبراتے دیکھ کر انہیں لطف آتا تھا۔ سڑکوں پر ہر وقت ہولناک نعرے لگاتے، شور مچاتے جلوس گزرا کرتے۔ در و دیوار پر اگتے ہوئے سبزے کے خنک رنگ پر سیاہ جھنڈیوں کی تاریکی مسلط ہوتی جا رہی تھی، کرشنا چورا کے پھولوں سے سرخ لہلہاتی ہوئی زمین پر جیسے ہر طرف خون بکھرا ہوا نظر آتا۔

اتوار کی شام کو ہمارے ڈرائنگ روم میں عبدالجلیل چودھری، رؤف مجمدار، رستم خاں اور روشن علی اب بھی جمع ہوتے لیکن اب باتوں کا رنگ اور ہوتا۔ وہ جانے کن کن بے انصافیوں کا شکوہ کرتے، کن کن مظالم پر دانت پیستے اور ہمارے واسطے سے اپنے دکھوں کا ذمہ دار انہیں ٹھہراتے جنہوں نے اس سونی دھرتی کی خاطر اپنی جوانی نچھاور کر کے وقت سے پہلے بڑھاپے کی چادر اوڑھ لی تھی اور اس دھرتی کے حال پر اپنا ماضی قربان کر دیا تھا۔ جو اپنی دھرتی کے سینے سے اپنی جڑیں اکھاڑ کر فضا میں معلق ہو گئے تھے۔ تب ہی کہیں سے چمپا آجاتی اور

اپنے لمبے لمبے سیاہ بالوں کو لہراتی، بڑی بڑی روشن اور معصوم آنکھوں کے ساتھ جھک کر میرے پاؤں چھوتی تو میں سب کچھ بھول کر اسے گلے لگا لیتی۔ وہ اپنی سانولی بانہیں میری گردن میں ڈال کر اپنے گال میرے گالوں سے ملا دیتی اور پہروں میری کرسی کے بازوؤں پر بیٹھی رہتی اور تب مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے چمپا کے بازوؤں اور اس کے گالوں کا لمس اس دھرتی کا لمس ہے۔ اس کے سیاہ بالوں سے اٹھنے والی ناریل کے تیل کی خوشبو اس دھرتی کی مٹی کی خوشبو ہے جو ہمیشہ باقی رہے گی۔ تب ہی گلی سے گزرتے ہوئے کسی جلوس کے دلخراش اور دل شکن نعروں سے یہ طلسم ٹوٹ جاتا اور ہم سب چونک اٹھتے، ایک دوسرے کی طرف چور نگاہوں سے دیکھتے اور محفل بڑی بے کیفی کے ساتھ برخواست ہو جاتی۔

حالات روز بروز سنگین ہوتے جا رہے تھے لیکن ہمارے دوست عبدالجلیل چودھری کا اصرار تھا کہ منّے اور چمپا کی شادی نہ سہی کم از کم منگنی ہی کر دی جائے تا کہ دو ہمسایوں کی پرانی دوستی رشتے میں بدل جائے۔ لیکن فضا پر چھایا ہوا عجیب قسم کا پراسرار خوف ہمیں مضطرب کیے ہوئے تھا۔ جلوسوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ نعروں میں کچھ اور زہرناکی پیدا ہو گئی تھی اور سیاہ جھنڈیاں دنیا کو جیسے تاریک کرتی چلی جا رہی تھیں۔ بچے شام کو ذرا دیر کے لیے کھیلنے جاتے تو مشعل بردار جلوس ان کی ساری تفریح غارت کر دیتے۔

آخرکار منگنی کی تقریب کا اہتمام کر لیا گیا۔ چودھری صاحب حالات کے بہتر ہونے کا انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہمارے تمام پڑوسی اور دوست گھر میں جمع تھے۔ لیکن سب کھوئے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ریڈیو پر نغمے گونج رہے تھے اور میں وقتی طور پر سب کچھ بھول کر اپنے منّے کو دیکھ رہی تھی جس کا بچپن مال گاڑی کے ڈبوں میں گزرا تھا اور جسے ہم نے بے شمار خواہشات کا گلا گھونٹ کر اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔

چمپا نے دلہنوں کا سرخ جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ کمرے کا ماحول اتنا خوشگوار نہ تھا کہ میں اسے دیکھ کر یہ بھول گئی کہ باہر ہولناک طوفان ہے جو بڑے بڑے تناور

درختوں کو اپنی جڑوں سے اکھاڑ کر اپنے ساتھ بہائے لیے چلا جا رہا ہے۔ لوگوں کے ہجوم صحرائی بگولوں کی طرح گلیوں اور بازاروں میں پھر رہے تھے اور ہر چیز کو جھلتے چلے جا رہے ہیں، اچانک باہر بڑے زور کا شور بلند ہوا اور فضا ہولناک نعروں سے دہل اٹھی۔ چمپا سرک کر منئے کے قریب ہوگئی۔ بچے جو ماحول سے بے نیاز خوش رنگ تتلیوں کی طرح پھدک رہے تھے، سہم کر ہمارے قریب آ گئے۔ راحت نے بڑی تشویش سے اپنے دوستوں کی جانب دیکھا۔ وہ سب ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔

ہمارے دروازے پر ایک شور برپا تھا۔ دروازے ڈنڈوں سے پیٹے جا رہے تھے۔ عبدالرؤف مجمدار باہر کی طرف لپکے۔ ہم سب سراسیمہ کھڑے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ میں نے لڑکھڑا کر وہ میز پکڑ لی جس پر کھانے پینے کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ درمیان میں وہ گلدان عجیب سا لگ رہا تھا جس میں چمپا اور منئے نے رنگ رنگ کے پھول سجائے تھے اور پھر ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دروازہ کھل گیا یا شاید ٹوٹ گیا۔ ہجوم ہمارے کمپاؤنڈ کے پھولوں اور پودوں کو روندتا ہوا اندر گھس آیا اور پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا۔

اور جب مجھے ہوش آیا تو محفل اُجڑ چکی تھی۔ جس کمرے میں کچھ دیر پہلے زندگی کی رونقیں بکھری ہوئی تھیں وہاں اب کچھ نہ تھا۔ فرش ایسا سرخ تھا جیسے کسی نے ہر طرف کرشنا چورا کے پھول بکھیر دیے ہوں۔ بہار کی تیز ہواؤں میں وولن چمپا اور گندھوراج کی خوشبو اب بھی پھیلی ہوئی تھی لیکن شیشے کا وہ گلدان ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا تھا جو مجھے زندگی سے زیادہ عزیز تھا اور جس میں ہم سب نے مل کر سرخ، زرد، اُودے، نیلے اور سفید پھول بڑی محنت سے سجائے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری زندگی بھر کی محنت کا ماحصل یہ گلدان ہی تو تھا جس کے بکھرے بکھرے ٹکڑے اب کبھی یکجا نہ ہوں گے۔

☆☆☆

رات سے پہلے

شام کے چھ بج چکے تھے اور ستمبر کی اس زرد شام کی تمام اداسیاں جیسے اس کے کمرے میں سمٹ آئی تھیں۔ دھڑکتے دل اور سہمی نگاہوں کے ساتھ وہ میز پر پیپر ویٹ سے دبے اس ٹیلیگرام کو دیکھ رہی تھی جو کھڑکی سے آنے والی تیز ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا اور جب بھی ہوا ساکت ہوتی اور کاغذ رکتا تو کاغذ پر چھپے ہوئے دو لفظ وہاں سے اچھل کر پوری شدت سے اس کی آنکھوں سے ٹکرا جاتے یوں جیسے کسی نے آہنی ہتھوڑا پوری طاقت سے اس کی آنکھوں پر دے مارا ہو۔

''کمنگ ٹو نائٹ'' (Coming Tonight) دو معصوم سے بے ضرر سے الفاظ تھے جنہوں نے اس کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جیسے انگاروں پر جمی ہوئی راکھ کوئی پھونک مار کر اڑا دے۔

کمرے کے دروازے پر کھڑا بوڑھا بابا اسے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا، پچھلے پندرہ سال سے وہ اس کے شب و روز کے معمولات کا امین تھا۔ پر آج تو اس نے اپنے اصولوں کی کئی خلاف ورزیاں کرڈالی تھیں۔ آج وہ پورے ایک گھنٹے کی تاخیر سے گھر پہنچی تھی اوراس کے ساتھ ایک اجنبی مرد کودیکھ کر بوڑھے بابا کو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا تھا۔ پر وہ ایک حقیقت تھی، اجنبی نے اپنی گاڑی اس کے پھاٹک پر روکی تھی۔ اسے اتار کر خدا حافظ کہا تھا اور وہ کچھ دیر وہیں کھڑی ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہتی رہی تھی۔

شمسہ زیدی ابھی تک اپنی میز کے سامنے خاموش بیٹھی تھی۔ چائے میز پر رکھی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ پھیلتے ہوئے اندھیرے کو دیکھ کر بوڑھے بابا نے ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کیا تو اچانک روشنی پھیل گئی اوراس نے نظریں اٹھا کر بوڑھے بابا کو دیکھا اور پھر اپنی ہتھیلیوں میں اپنے سر کو دبا کر اسی کاغذ کو گھورنا شروع کر دیا جس کے نیچے اس کا پاسپورٹ، امریکہ جانے کا ویزا اور دوسرے سفری کاغذات رکھے تھے۔

گھڑی کی ٹک ٹک اور ہوا سے پھڑ پھڑاتے کاغذ کی آواز کے سوا کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ وقت رینگتا ہوا گزر رہا تھا جس کا اسے کوئی احساس نہ تھا۔ ٹیبل لیمپ کی زرد روشنی میں کمرے کا ماحول کچھ اور بھی ویران اور اداس اداس سا لگ رہا تھا۔

اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پانی کا بھرا ہوا گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں پی گئی جیسے برسوں کی پیاسی ہو یا تپتی ہوئی ریت پر گھنٹوں سفر کرنے کے بعد پیاس کی شدت سے نڈھال ہو۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ اندھیرے میں روشنی کے انگنت نقطے اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

''تو آج وہ آ رہا ہے۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی اور جیسے ساری عمر کی تھکن اس پر اچانک ہی ٹوٹ پڑی ہو۔ گیٹ سے باہر اونچے اونچے درختوں پر رات کے سائے اتر رہے تھے۔ ان درختوں کے درمیان روشنی کے اداس نقطے تنہائی کے احساس کو شدید تر بنا رہے تھے۔

آج کا دن شاید اَن ہونے واقعات و حادثات کے لیے مقرر تھا۔ ایسے واقعات جو اس کے آہنی وجود کو پگھلا رہے تھے۔ صبح تک وہ بالکل نارمل تھی۔ اس نے معمول کے مطابق اپنی کلاسیں ختم کیں۔ امریکہ کے سفر کے لیے اپنے کاغذات مکمل کیے تھے۔ پھر لیبارٹری میں دیر تک ڈاکٹر وقار کے ساتھ کام کرتی رہی تھی۔ لیکن ڈپریشن نہ جانے کیوں اس کے پورے وجود پر طاری تھا اور یہ ڈپریشن اسی وقت سے طاری تھا جب سے اس نے اپنے کاغذات مکمل کر کے پاسپورٹ حاصل کیا تھا۔ وہ عالمی سائنس کانفرنس میں ایک اسکالر کی حیثیت سے اپنے ملک کی نمائندگی کرنے جارہی تھی۔ یہ اس کے کیریئر کی معراج تھی جس کے لیے اس نے برسوں جدوجہد کی تھی لیکن اکسائٹمنٹ کی بجائے ڈپریشن اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اداس ہوتی چلی جارہی تھی۔

اداسی کی اسی کیفیت میں ڈاکٹر وقار نے آج پھر اپنی وہ پیشکش دہرائی جس کا اظہار اشاروں میں وہ کئی سال سے کررہا تھا لیکن آج اس کی اس پیشکش سے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دل کا وہ دروازہ جس پر وقت نے زنگ کی مہر لگادی تھی اس دستک سے چرچرا اٹھا ہو۔ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود تنہائی کی ایک یلغار تھی جو اسے بہائے لیے چلی جارہی تھی۔ اس کمزور لمحے میں ڈاکٹر وقار نے اپنی پیشکش کچھ اس حسرت سے دہرائی کہ ہر بار کی طرح نہ تو اس نے مَردوں کے روایتی حقِ ملکیت پر لکچر دیا اور نہ ہی یہ کہہ کر اس کا دل جیتنے کی کوشش کی کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

شمسہ زیدی ڈاکٹر وقار کی پیشکش کو اس بار نظرانداز نہ کرسکی اور اس نے اسے واضح طور پر قبول کر کے ڈاکٹر کو حیران کردیا۔ وہ حصار جو پچھلے پندرہ سال سے اس نے اپنے گرد کھینچ رکھا تھا، آخرکار آج ٹوٹ گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس اقرار سے دل کا بوجھ ہلکا ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا تھا۔ اس کے اعصاب بدستور منتشر تھے اور احساسِ تنہائی شدید تر ہوتا جارہا تھا۔

میز پر پیپر ویٹ تلے دبے ہوئے اس کے سفر کے کاغذات اسے اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے لیکن ان کاغذات کے اوپر رکھا ہوا ٹیلیگرام ''کمنگ ٹو نائٹ'' کی اطلاع دے رہا تھا اور اس کے پورے وجود کو ہلائے دے رہا تھا۔ کھڑکی کے قریب سے ہٹ کر وہ دروازے کے قریب آئی اور اسے کھول کر باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ ابھی صرف شام کے سات بجے تھے لیکن دور دور تک اندھیرے اور سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ستمبر کی ہلکی خنک ہوا سے درختوں کی شاخیں لہرا رہی تھیں اور ان سے عجیب سی غمناک سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

شمسہ زیدی نے محسوس کیا جیسے وہ اندر ہی اندر پگھل رہی ہو۔ پچھلے پندرہ سال سے وہ ایک پلانٹ کی مانند گھڑی کی سوئیوں کے اشاروں پر اپنے شب و روز بسر کر رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ مصروف اور کارآمد۔ اس کی نظریں آگے کی طرف دیکھتی رہی تھیں۔ دماغ آگے کی سوچتا رہا تھا۔ پر جانے آج اس پلانٹ میں کہاں کیا گڑبڑ ہو گئی تھی کہ وہ آگے کی طرف دیکھنے کی بجائے پیچھے کی طرف چل پڑی تھی جہاں وہ راستہ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا جس پر برسوں برس چلتی ہوئی وہ اطمینان و مسرت کی اس منزل تک پہنچی تھی۔

اس نے دور سڑک پر اندھیرے میں دوڑتی بھاگتی گاڑیوں کو دیکھا جو روشنی کے نقطوں کی مانند اِدھر اُدھر حرکت کرتی نظر آ رہی تھیں۔ وہاں اسے سرخ فراک، سرخ موزے اور جوتوں میں ملبوس ایک ننھی سی بچی نظر آئی جو سرخ ربن سے بندھی پونی ٹیل لہراتی تتلیوں کے پیچھے بھاگتی ریڈ رائیڈنگ ہڈ نظر آ رہی تھی پھولوں کو توڑتی، انہیں اپنے ہاتھوں میں سنبھالتی، سوسن کے کاسنی اور سفید پھولوں کے جھنڈ میں دائیں بائیں دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک اسے ان جھاڑیوں کے پیچھے وہ مکار بھیڑیا نظر آ جاتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر پھولوں کو پھینک کر بھاگتی چلی جاتی ہے۔ پھولوں بھری وہ وادی جو چشمے کی گنگناہٹوں اور شہد کی مکھیوں کی خواب آور بھنبھناہٹوں سے گونج رہی تھی اپنی تمام خوشبوؤں سمیت دور ہوتے ہوتے بہت پیچھے رہ گئی اور اب اس کے پیروں کے نیچے سنگلاخ زمین تھی اور بھورے بے درد کانٹے۔ ان

پتھروں اور کانٹوں میں دوڑتے دوڑتے اس کے پیر لہولہان ہو گئے تھے اور پھر وہ بھاگتی ہوئی بچی صندل جیسی رنگت والی ایک نازک بدن لڑکی میں بدل گئی تھی جس کے سیاہ لمبے بال اس کی کمر کے نیچے لہرا رہے تھے اور وہ اپنی منزل کی طرف بھاگتی جا رہی تھی۔

اور اب اس کی راہ میں وولن چمپا اور رجنی گوندھو کے کنج تھے، دھان کے کھیتوں کے بیچوں بیچ سرخ کنول سے بھرے تالاب تھے۔ دور حدِ نظر تک آم اور کٹھل کے باغوں اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ تھے، برہم پُترا کی موجوں میں بل کھاتی ہوئی کشتیوں سے ابھرنے والے مانجھیوں کے گیت گونج رہے تھے، ندیوں اور نالوں کے پُرسکون کناروں تک جھکے ہوئے دھان کے خوشے تھے اور رم جھم برستی برکھا کی پھواریں تھیں۔ وہ یہ سب کچھ پیچھے چھوڑتی ہوئی بس چلی جا رہی تھی۔ پر اب اس کی چال میں بڑا وقار، بڑی تمکنت اور ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے باپ کے جنازے کو قبرستان کی طرف جاتے دیکھا اور اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

اور پھر وہ تھی اور اس کی ماں۔ اور وہ دونوں ایک تپتے ہوئے ریگ زار میں کھڑے تھے۔ ماں نے اس کے سر پر اپنے مہربان آنچل کا سایہ کر رکھا تھا تاکہ سورج کی بے رحم کرنیں نیزوں کی طرح اس کے چہرے کو زخمی نہ کر سکیں۔ اپنی اسی کمزور ماں کے پُرشفقت آنچل کے سائے میں اس نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور خود اعتمادی کا پہلا زینہ چڑھ کر بڑے اطمینان سے اپنے اردگرد دیکھا۔ اس وقت کرشنا چورا کے وہ پھول جو باپ کی موت کے بعد اسے انگارے سے لگتے تھے پھر خوبصورت نظر آنے لگے تھے اور رجنی گندھا اور وولن چمپا سے کنج بھر گئے تھے۔ آم اور کٹھل کے باغوں میں کوئل پھر سے کوکنے لگی تھی اور فضا پھر سے شفق رنگ ہو گئی تھی۔ اپنی زندگی کا نصب العین اس نے اپنے شفیق باپ کی خواہش کے مطابق طے کر لیا تھا اور اسے حاصل کرنے کے لیے تن من کی بازی لگا دی تھی۔

لیکن اس کی بوڑھی ماں اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے کوشاں تھی۔ اسے اپنی

اکلوتی حوصلہ مند بیٹی کے سر پر تنی ہوئی اوڑھنی میں بہت سے چھید نظر آ رہے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ تار تار ہو جائے اسے اس کے سر پر ایک مضبوط چھت مہیا کرنی تھی اور جب ٹھنڈے سایوں والی مستحکم چھتیں اس کی طرف بڑھنے لگیں تو اس نے محفوظ ترین چھت منتخب کر لی۔

اس کے مغرور اور وجیہہ شوہر نے اپنی دولت سے اس کے لیے جن مسرتوں کا اہتمام کیا ان کی کوئی قدر و قیمت اس کی نگاہوں میں نہ تھی۔ شانے سے شانہ ملا کر چلنے اور تلخ و ترش تجربوں میں باہمی شراکت کا جو تصور اس کے ذہن میں تھا وہ ریزہ ریزہ ہو گیا، اپنی دولت اور مردانہ برتری کے غرور نے اس کے شوہر کے سر کو بہت بلند کر دیا تھا۔ وہ اسے سیم و زر سے آراستہ کر کے اپنی وجاہت اور دولت کے سامنے شکر گزاری کے سجدے قبول کرانے کا متمنی تھا اور وہ زندگی کی شاہراہوں پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلنے کی آرزو مند۔

بہت جلد وہ اس رشتے سے متنفر ہو گئی۔ اس کی آرزو ایک خواب بن کر بکھر گئی اور شوہر کے ساتھ نباہ کا تعلق ماں کے شیشۂ دل کی حفاظت کی خاطر محض ایک مصلحت بن گیا۔ یوں نباہ ہوتا رہا اور وہ اپنی علمی مصروفیتوں میں گم ہو گئی۔ اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف وہ تعلیم حاصل کرتی رہی۔ نفرتوں اور تلخیوں کے اس ماحول میں وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔

اسی وقت طوفانوں اور سیلابوں کی سرزمین ایک نئے اور بھیانک طوفان کی لپیٹ میں آ گئی۔ چھوٹے چھوٹے پودوں کا تو ذکر کیا بڑے بڑے تناور درخت بھی اپنی جڑوں سے اکھڑنے لگے۔ نفرتوں کی خوں رنگ شفق سے مطلع تاریک ہونے لگا۔ خوابوں کے جال بُننے والے سیلاب کی زد میں بہنے لگے۔ ناخن سے گوشت جدا ہونے لگے۔ نچے ہوئے ناخنوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور خون ٹپکتی انگلیاں انہیں اپنے جسم کا حصہ ماننے سے انکار کرنے لگیں۔ خوبصورت مناظر نے خوں رنگ لباس پہن لیے۔ پرندوں نے چہکنا بند کر دیا۔ پدما اور برہم پُترا کی بپھری ہوئی موجوں نے دامانِ ساحل تار تار کر دیا۔ ملاحوں کے سرمدی نغمے چنگھاڑتی ہوئی موجوں کے جان لیوا تھپیڑے بن گئے۔ ہرے بھرے درختوں کی شاخوں نے سانپوں

اور اژدھوں کا روپ دھار لیا۔ پکتے ہوئے دھان کے سنہرے آویزے دھاردار بھالے بن گئے۔ کرشنا چورا کے پھول انگارے بن کر فضا میں بکھر گئے اور وہ زمین وہ آسمان جن سے اس کا جنم جنم کا ساتھ تھا بدل کر رہ گئے۔

اس نئے طوفان میں اس کے شوہر کی ناآسودہ اَنا کو تعصب کا ایک نیا روپ مل گیا۔ اس کی نگاہوں میں غیریت، اجنبیت، نفرت اور بے اطمینانی کے خوفناک چراغ جل اٹھے جس سے اندھیرا کچھ اور بڑھ گیا اور جب طوفان تھا تو نفرت کی ایک بلند دیوار کے پیچھے اس کا سب کچھ چھوٹ گیا۔ طوفان میں اڑ کر وہ کہیں سے کہیں آ پہنچی تھی۔

اب وہ ایک مشین بن گئی تھی لیکن اس آہنی مشین کا ایک پُرزہ دھڑکنے لگا تھا جیسے زنگ خوردہ قفل توڑ کر باہر نکلنے کو ہے۔ یادیں دستک دے دے کر اسے کمزور کیے جا رہی تھیں۔ حبس سے پیدا ہونے والے ڈپریشن نے طوفان کے آثار پیدا کر دیے تھے، زمانے بھر کی اداسیاں اس پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ دل، درد سے بوجھل تھا۔ یادوں کے پَرے کے پَرے اُس کے سامنے سے گزر رہے تھے اور اس کے قدم اکھڑے جا رہے تھے۔ وہ بہت سے بڑے چھوٹے درختوں کے ہجوم میں ایک خوبصورت پودے کی مانند ابھری تھی۔ مہربان درختوں نے اپنے سائے میں اسے پروان چڑھایا تھا۔ سورج کی گرمی اور آندھیوں کے جھکڑوں سے بچایا تھا اور جب یہ جھومتا لہراتا پودا آس پاس کے درختوں کا سہارا لیتا ہوا بڑھا تو اسے ناپسندیدہ قرار دے دیا گیا جو دیسی پودوں کے درمیان اجنبی، نامناسب اور ناموزوں تھا۔ اسے اکھاڑ کر دیوار کے اُس پار پھینک دیا گیا۔

دیوار کے اس پار ریت ہی ریت تھی۔ گرمی، حبس اور گھٹن نے اس کا برا حال کر دیا۔ اس کی رگ رگ میں بسی ہوئی زمین کی باس اس پر رِم جھم کرتی برسات، اندھیری ہولناک راتوں اور اُمنڈتے دریاؤں کی متلاشی تھی۔ وہ فضا اور ماحول اس کے وجود میں سرایت کر چکا تھا۔ وہ حیران حیران نظروں سے ناریل کے درختوں کے جھنڈ تلاش کرتی۔ بانس

کے گھروں میں رہنے والے سادہ لوح لوگوں کی محبتیں، ان کی شفیق صورتیں، وہ کیچڑ بھری گلیاں اور بازار، اس کا اسکول، کالج، وہاں گزارے ہوئے شب و روز، وہ لڑکیاں، استانیاں، پرنسپل، وہ سب لوگ کہاں گئے، وہ کہاں آ گئی ہے۔ مگر نہیں وہ خود تو نہیں آئی اسے باغ سے ناپسندیدہ گھاس پھوس سمجھ کر اکھاڑ کر پھینکا گیا ہے۔ اس کی اکھڑی ہوئی جڑوں سے چمٹی ہوئی گیلی مٹی کی خوشبو ابھی تک تازہ ہے اور اپنی اصل سے مل جانے کے لیے بے قرار۔ وہ خلا جہاں سے اسے اکھاڑا گیا ہے۔ اندھے کی آنکھوں کی طرح ویران ہوگا، پر اب وہ اس میں کس طرح سما جائے۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اسے احساس دلایا کہ اس کے گالوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر اس کی گود میں گرتے جا رہے تھے۔ اس نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور اندھیرے میں اپنی گیلی ہتھیلیوں کو دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھوں میں خون لگا ہوا ہو۔

وہ اپنے کمرے میں واپس آئی تو لیمپ کی محدود روشنی میں اپنا کمرہ اسے اور بھی ویران اور خالی خالی سا محسوس ہوا۔ میز پر ٹیلیگرام ویسے ہی پھڑ پھڑا رہا تھا۔

''کمنگ ٹو نائٹ'' اس نے چونک کر گھڑی کی طرف نظر اٹھائی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ اب وہ آنے ہی والا ہے۔ اس خیال سے وہ پریشان ہوگئی، اِدھر اُدھر نظر دوڑائی جیسے کسی کو مدد کے لیے تلاش کر رہی ہو مگر وہی ظالم بے درد تنہائی پورے کمرے پر محیط تھی۔

''وہ کیوں آ رہا ہے؟ کیوں؟'' اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ اسے اپنے شوہر کے الفاظ یاد آ گئے۔ وہ اس کا عزم یاد آ گیا کہ وہ اسے کچھ نہیں بننے دے گا۔ تم میری بیوی کے سوا کچھ نہیں بن سکتیں۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا تھا تو کیا وہ یہاں آ کر اس سے اپنا انتقام لے گا کہ کیوں وہ اتنی بڑی اسکالر بن گئی کہ بین الاقوامی کانفرنس میں اسے نمائندگی کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ کیا وہ اسے بدنام کرے گا۔ وہ خوف سے لرز اٹھی۔ آخر وہ ایسا کیوں کرے گا اس نے تو مجھے نفرتوں کے طوفان کا سہارا لے کر دیوار کے اِس پار دھکیل دیا تھا۔ پھر خود دیوار کے

آس پاس رہ گیا تھا کیونکہ بزعم خود وہ اسی سرزمین کا پودا تھا۔

شمسہ زیدی انجانے خوف سے لرز رہی تھی، طرح طرح کے وسوسے اسے اندر ہی اندر ریزہ ریزہ کیے دے رہے تھے، وہ ایک بے بس بچی کی طرح خوف زدہ تھی جسے محبت بھری آغوش کی ضرورت تھی جس میں منہ چھپا کر وہ محفوظ و مامون ہو جائے مگر گھڑی کی ٹِک ٹِک کے سوا کوئی آواز نہ تھی اور وقت لحظہ لحظہ کر کے گزر رہا تھا۔

اسی وقت کال بل کی آواز سے وہ یوں اچھل پڑی جیسے اس کے کانوں کے قریب کسی نے بندوق داغ دی ہو۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی جدھر سے وہ نمودار ہو رہا تھا۔ بابا کے پیچھے پیچھے تُلے قدم اٹھاتا وہ کمرے میں داخل ہوا تھا لیمپ کی زرد روشنی میں اس کا سایہ پورے کمرے پر محیط ہو گیا تھا۔

وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ویسا ہی باوقار اور پُر غرور۔ البتہ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو رہے تھے۔ یہی وہ نقصان تھا جو پچھلے پندرہ برسوں نے اسے پہنچایا تھا۔ وہ کسی تمہید کے بغیر کہہ رہا تھا۔ ''دو بار تمہارا پتہ معلوم کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر واپس جا چکا ہوں لیکن اس بار مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔''

''کیوں؟'' اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''اس لیے کہ اب تم اس ملک کی ایک نامور شخصیت بن گئی ہو۔''

شمسہ زیدی اس کے اس فخریہ لہجے سے حیران رہ گئی۔ ماضی کی تلخیوں نے اس پر یلغار کر دی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ اس کے کچھ اور قریب آ گیا۔ جھک کر اس کا چہرہ دیکھا اور شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے نرمی سے کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ بیمار ہو تم؟ میرے آنے سے خوشی نہیں ہوئی تمہیں؟''

اس نے کئی سوالات پوچھ ڈالے تھے جن کی اس سے کوئی توقع نہیں تھی۔ ان

سوالوں میں طنز کے نشتروں کی جگہ اپنائیت کا مرہم تھا۔ اس نے اپنے سامنے جھکے ہوئے اس پُر وقار آدمی کی طرف دیکھا جو اس دھرتی کی خوشبو سے بسا ہوا تھا جس کی بُو باس کے لیے وہ اتنے عرصے سے ترس رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے برسوں بعد کرشنا چُورا اور رجنی گوندھو کی متوالی خوشبوؤں نے اس کے کمرے پر یلغار کر دی ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر کھڑکی کے باہر دیکھا تو کٹھل اور آم کے درختوں اور کیلے اور اناناس کے باغوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا نظر آیا جانی پہچانی مانوس خوشبوؤں نے جیسے اس کے پورے وجود کو گھیر لیا۔

وہ پھوار جو آج صبح ہی سے اس کے اندر پڑ رہی تھی اب ٹوٹ کر برسنے لگی۔ اس نے بے اختیار اپنا سر اُس کے شانوں پر رکھ دیا اور اس کا کمرہ جیسے چھت سے فرش تک روشنی سے بھر گیا۔

☆☆☆

منزل کہاں ہے تیری

''ہم کب تک یوں ہی چلتے رہیں گے؟''

''جب تک منزل نہ آ جائے!''

''منزل ہے کہاں؟''

''جہاں ہمارا سفر ختم ہو جائے گا۔''

''یہی تو میں پوچھتی ہوں ہمارا سفر کب اور کہاں ختم ہوگا؟'' عورت نے بیزاری اور مایوسی سے پوچھا ''کوئی حد ہے۔ جب ہم چلے تھے تو ہمارے بال سیاہ تھے اور اب تم دیکھ رہے ہونا؟''

''دیکھ رہا ہوں'' مرد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''تم کو یاد ہے جب ہم نے سفر شروع کیا تھا تو ہماری منزل وہ تھی جہاں لوگوں کے دل سیاہ نہ ہوں گے۔''

''تم پاگل ہو!''

''تم بھی پاگل ہو۔'' مرد نے کہا ''تم سے کس نے کہا تھا کہ میری شریک سفر بن جاؤ۔''

''میں اکیلی تو نہ تھی'' عورت نے کہا ''ہزاروں تھے۔ وہ آواز ہی ایسی مسحور کن تھی کہ سب مست ہو کر گھروں سے نکل آئے تھے اور آواز کی سمت چل پڑے تھے۔''

''تو پھر مجھے الزام کیوں دیتی ہو؟''

''اور کیا کروں؟'' عورت بے بسی سے بولی ''اس منحوس سفر نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ چلتے چلتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔''

''منزل پر پہنچ کر ساری کلفت دور ہو جائے گی۔''

دونوں چپ ہو گئے۔ مرد نے افق پر نگاہیں جما دیں جہاں گھنے درختوں کے درمیان شاید کسی گاؤں کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہ بڑی بے تابی سے بستی کی سمت بڑھنے لگے۔ دنیا کے اولین جوڑے کی طرح سرگرداں۔ جیسے صدیوں سے پہاڑوں، بیابانوں، دریاؤں اور صحراؤں کو پار کرتے کرتے تھک گئے ہوں۔

وہ تھکن سے نڈھال تھے، راستے کی سختیاں سہتے سہتے ان میں زبان تک ہلانے کی سکت نہ تھی۔ مرد نے اپنا فرض محسوس کرتے ہوئے عورت کو تسلی دی اور وہ نہایت خاموشی سے اس ٹیلے سے نیچے اتر گئے جس کے پار ناریل اور کیلے کے درختوں کے جھنڈ میں گاؤں انگوٹھی میں نگینے کی طرح جگمگا رہا تھا۔ ہوا سے ہلتے ہوئے درختوں کے درمیان بانس کی چٹائیوں اور قمچیوں سے بنی ہوئی دیواریں اور کھڑکیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

انہوں نے نئی تازگی اور توانائی محسوس کی جیسے انہیں منزل تک پہنچنے کا یقین ہو گیا ہو اور صدیوں پہلے جو سفر شروع ہوا تھا وہ شاید اب ختم ہو رہا ہو۔

جب وہ گاؤں میں پہنچے تو سورج اپنا سفر ختم کر رہا تھا اور کرنوں کے نکیلے نیزے اپنی تمازتیں سمیٹ رہے تھے۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ گاؤں کے بیشتر گھر خالی

تھے۔ بستی ویران پڑی تھی۔ البتہ کہیں کہیں چند بوڑھے ڈرے سہمے بیٹھے تھے جیسے کسی نادیدہ دشمن سے خوفزدہ ہوں۔

''یہ سب کہاں چلے گئے؟'' اس نے ایک بوڑھے سے پوچھا جو اپنی دہلیز پر بیٹھا بُری طرح کھانس رہا تھا۔ وہ کچھ نہ بولا اور صرف سر کے اشارے سے دور گاؤں کے ایک سرے کی طرف اشارہ کیا جہاں مردوں، عورتوں، بچوں اور جوانوں کا ہجوم ایک تناور درخت کو گھیرے کھڑا تھا۔ اُنہوں نے سنا اُدھر سے مہیب شور بلند ہو رہا تھا۔ شاید ہجوم نعرے لگا رہا تھا۔ انسانوں کا ایک انبوہ تھا جو سخت مشتعل اور پُر جوش ادھر سے اُدھر حرکت کر رہا تھا۔ عورت جو بہت زیادہ تھک گئی تھی بوڑھے کے برابر دہلیز پر بیٹھ گئی۔

''یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟'' اُس نے بوڑھے سے پوچھا۔

''دشمن کا صفایا'' بوڑھے نے سرگوشیوں میں جواب دیا۔

''دشمن؟'' مرد نے حیرت سے سوال کیا ''کہاں؟ کدھر؟''

''وہ بلند و بالا اور تناور درخت تم نہیں دیکھ رہے ہو جس کی جڑیں ہماری دھرتی کی چھاتی میں بڑی بیدردی سے پیوست ہیں۔''

''درخت؟ مگر تم تو کسی دشمن کی بات کر رہے تھے!''

''وہی تو ہمارا اصل دشمن ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ درخت بھی دشمن ہوتے ہیں؟''

''ہم بھی یہی سمجھے تھے۔ سچ پوچھو تو ہمیں اب بھی یقین نہیں مگر......''

''مگر؟''

''ہمارے بچے ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ وہ اسی دھرتی کے بیٹے ہیں۔ اُن سے بہتر اس کا بُرا بھلا کون جانتا ہے۔''

''وہ اس درخت کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں؟''

''ہاں بابا ہاں'' بوڑھے نے کہا ''تم بیٹھ جاؤ۔ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔''

وہ حیران سا وہیں اس بوڑھے کے پاس بیٹھ گیا۔ بوڑھا چپ چاپ حقے کے کش لگاتا رہا اور اُدھر دیکھتا رہا جہاں گاؤں کی تقریباً پوری آبادی ایک درخت کو گھیرے کھڑی تھی اور بے شمار کلہاڑیوں سے اس کے تنے اور شاخوں کو لہولہان کر رہی تھیں۔

''آخر یہ ماجرا کیا ہے؟'' اس نے قدرے توقف کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو ان سے پوچھو جو اس منحوس کو جڑ سے کاٹ پھینکنے کا عزم کر چکے ہیں۔''

''آخر وہی کیوں؟'' اس نے پوچھا ''یہاں تو ہر طرف درخت ہی درخت ہیں۔''

''یہ ان سب سے الگ ہے'' بوڑھے نے جواب دیا ''اس کی جڑیں ہماری زمین کی شادابیوں کو چوس رہی ہیں اور اس کا گھنا سایہ سورج کی روشنی کو ہماری زمین تک آنے سے روک رہا ہے۔''

''یہ بھی تو دیکھو کہ اس کے سائے میں پورا گاؤں تپتی ہوئی دھوپ سے پناہ لے سکتا ہے۔''

''بکواس! ہمیں پناہ لینے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہمیں سورج کی روشنی چاہیے۔''

''مگر درخت لگایا کس نے؟'' اس نے پوچھا۔

''برسوں پہلے جب ہماری نوجوانی کا عالم تھا ایک لاغر بوڑھا کہیں سے آیا تھا۔ اس نے گاؤں پر کچھ ایسا سحر کیا کہ ہم سب اُسی کا دم بھرنے لگے۔ وہ چلا گیا لیکن اس کی باتیں گونجتی رہیں۔ تب ایک روز یہ درخت نمودار ہوا۔ کہتے ہیں وہی بوڑھا اس کے بیج یہاں لایا تھا۔''

''اچھا!''

''ہاں! اور پھر مغرب سے ایک آندھی اٹھی اور انسانوں کا ہجوم خزاں رسیدہ پتوں اور شاخوں کی طرح ہر سمت بکھر گیا۔ اِدھر بھی کافی لوگ آئے۔ پھر انہوں نے اسی درخت کے سائے میں پناہ لی۔

''پھر؟''

''پھر تو اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہوئیں۔ جن لوگوں نے اس

کے سائے میں پناہ لی تھی وہ اسے مقدس سمجھنے لگے۔ وہ کہتے یہ وہ درخت ہے جس کے سائے میں کپل وستو کے شہزادے کو شانتی کا سندیسہ ملا تھا۔''

''بڑی عجیب بات ہے!'' اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں بڑی عجیب بات'' بوڑھے نے کہا ''وہ بیج جو یہاں کی مٹی میں دفن کیا گیا دیکھتے دیکھتے ایک بڑے سایہ دار درخت میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی جڑیں پھیلتے پھیلتے بستی کے گوشے گوشے میں پہنچ گئیں۔ اور پھر کیچڑ اور پانی میں لتھڑا ہوا یہ گاؤں دور دور مشہور ہو گیا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ جن لوگوں نے اس کے سائے میں بڑی بے سروسامانی کے عالم میں پناہ لی تھی وہ خوب پھلے پھولے۔ اور تب یہ خیر و برکت کی علامت بن گیا۔''

''لیکن اب لوگوں کے عقیدے کو کیا ہوا اور وہ اس کے دشمن کیوں ہو گئے؟''

''یہی تو بات ہے!'' بوڑھا بولا ''درخت کی نحوست کی طرف ہمارا دھیان بھی نہ جاتا۔ لیکن ایک روز اُس پار کے ایک گاؤں سے رات کی تاریکی میں کچھ لوگ آئے۔ انہوں نے ہمارے بیٹوں کو بتایا کہ یہ منحوس ہے اور اس کی نحوست نے اس کے یہاں لوگوں کی نیندیں اُڑا دی ہیں۔ اگر اس کو کاٹا نہ گیا تو اس کی نحوست آس پاس کے دوسرے قصبوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔''

''اچھا! اور تم نے اُن کی باتوں پر یقین کر لیا؟''

''کیوں نہ کرتے؟ وہ ہمارے دشمن تو نہ تھے۔ ہم صدیوں تک ایک تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے گاؤں پر آنے والی ہر آفت اور ہر طوفان اسی درخت کی نحوست کا نتیجہ ہے۔ اور بات ہماری سمجھ میں آ گئی۔''

''بات سمجھ میں آ گئی؟''

''ہاں۔ اور فیصلہ کر لیا گیا کہ درخت کاٹ دیا جائے۔''

''تمہارا فیصلہ اٹل تھا؟''

''ہاں! مگر یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ پورے گاؤں میں اس کی جڑیں پھیلی ہوئی

ہیں۔ اور بہت سارے لوگ آج بھی اسے خیر و برکت کی علامت سمجھتے ہیں۔ وہ ہماری مسلسل مزاحمت کر رہے ہیں لیکن ہمارے دوستوں نے اس مشکل کا حل بھی بتا دیا ہے۔''

''کیسے روکو گے اُن کی مزاحمت کو؟''

''جو ہماری راہ میں حائل ہوگا اُسے بھی درخت کی شاخوں کی طرح کاٹ دیا جائے گا۔ دیکھو پورا گاؤں اس پر ضربیں لگا رہا ہے۔''

''تم تو ہم پرست ہو۔'' اس نے کہا ''درخت انسانوں کے مصائب اور راحتوں کا باعث کب ہوتے ہیں۔''

''جو بھی ہو!'' بوڑھا پُرعزم تھا ''اب تو یہ کٹ کر رہے گا۔''

''مگر وہ جو مزاحمت کر رہے ہیں؟''

''کمبخت وہی ہیں جنہوں نے جانے کہاں کہاں سے آکر اس کے نیچے پناہ لی تھی'' بوڑھا بولا۔ پھر کچھ دیر اُدھر دیکھتا رہا۔ کہنے لگا۔

''آؤ اب تمہیں اصل تماشہ دکھاؤں۔''

اور جب وہ درخت کے قریب پہنچے تو انہیں ہر طرف لاشیں بکھری نظر آئیں۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں، مگر لوگوں کا جم غفیر ان سے بے نیاز درخت کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑا تھا۔ یوں کہ اس کے قریب پہنچنا بھی مشکل تھا۔ پسینے میں شرابور ننگے سیاہ جسم دھوپ میں تپ رہے تھے اور درخت پر دیوانہ وار ضربیں لگا رہے تھے۔

ایک اور ہجوم بڑھ بڑھ کر کلہاڑی چلانے والے ہاتھوں کو روکنے میں اپنی جان کی بازی لگا رہا تھا۔ وہ نہتے تھے اور لہولہان تھے۔ اُن کے ہاتھ بھرپور ضربوں کو روکنے کی کوشش میں کٹ رہے تھے۔ گردنیں جسم کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں مگر ان کے حوصلے پست نہ ہوتے تھے۔ جب کسی کی کاری ضرب سے کوئی شاخ کٹ کر گرتی یا کوئی گردن کٹا جسم دھم سے گرتا تو ہجوم مسرت سے چیخ اٹھتا۔ جیسے انہوں نے اپنے ازلی دشمنوں کے ٹکڑے اڑا دیے ہوں۔ نوعمر لڑکے گردن کٹے جسموں اور کٹی ہوئی شاخوں کو گھسیٹ کر دور لے جا رہے تھے۔ بعضوں

نے کٹے ہوئے سروں کو اپنی ٹھوکروں سے فٹ بال کی طرح اِدھر اُدھر اچھالنا شروع کر دیا تھا اور اپنے اس کھیل میں مست تھے۔ وہ درختوں کے شاداب پتوں اور ہری ہری شاخوں کو اپنے پیروں تلے روند رہے تھے۔

''تمہارے گاؤں کے لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے'' اس نے بوڑھے سے پوچھا ''ایک درخت کو کاٹنے کے لیے اس قدر دیوانگی۔ یہ تو تمہیں ٹھنڈک اور سایہ فراہم کرتا ہے۔''

''تم کیا جانو'' وہ بولا ''مسافر ہو اِدھر سے آئے اور اُدھر چلے جاؤ گے۔''

''مگر درخت کاٹنے کے لیے اتنی خونریزی؟''

''خونریزی؟'' وہ بولا ''یہ تو نحوست سے نجات حاصل کرنے کے لیے قربانی دی جا رہی ہے۔''

وہ حیران سا کھڑا اس سارے تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہجوم کی وحشت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ گھنے اور سایہ دار درخت کی شاخیں کٹ چکی تھیں اور مشتعل ہجوم انہیں ریزہ ریزہ کر کے پھینک چکا تھا۔ لیکن درخت کا تنا ابھی باقی تھا اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ تمام کلہاڑیاں براہ راست تنے پر وار کر رہی تھیں۔ ہر ضرب سے چھال سمیت گیلی لکڑی کا کوئی ٹکڑا کٹ کر فضا میں اڑتا اور ساتھ ہی کسی کا ہاتھ بھی کٹ جاتا۔ پُر جوش ہجوم یوں چیختا جیسے کسی دشمن کا سر کاٹ کر فضا میں اچھال دیا ہو۔ جو لوگ کلہاڑیاں چلاتے چلاتے تھک جاتے وہ ایک طرف ہو جاتے اور ان کی جگہ تازہ دم گروہ شامل ہو جاتا۔ گروہ بھی اپنی دھن کے پکے تھے جو کٹ کٹ کر گر رہے تھے، لہولہان ہو رہے تھے مگر درخت کو کٹنے سے بچانے کے لیے بڑھ بڑھ کر مزاحمت کر رہے تھے۔ ایسا لگتا جیسے دونوں ہی پاگل ہو گئے ہوں۔

اور پھر اس نے دیکھا کہ جوانوں کا ہجوم قدرے مایوس سا ہو گیا ہے۔ صبح سے تیسرا پہر ہو گیا۔ درخت پر لاتعداد ضربیں لگائی جا چکیں، شاخیں ختم ہو گئیں، پتے بکھر گئے، مگر جڑ تھی کہ زمین چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ وہ صبح سے بھوکے پیاسے مسلسل محنت کر رہے تھے کہ جب تک یہ منحوس درخت نہ گر جائے ان پر دانہ پانی حرام ہے۔ مگر اُن کا عزم متزلزل ہو رہا

تھا۔ وہ سخت بے یقینی کے عالم میں ضربیں لگا رہے تھے۔

تب اچانک ایک سمت سے ایک شور بلند ہوا اور ایک ہجوم نمودار ہوا۔ وہ تازہ دم تھے اور ان کے چہرے بشاش اور مسرت سے دمک رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھ تیز دھار والے لمبے چوڑے آرے لائے تھے۔

''او ہو اب درخت کٹ جائے گا'' بوڑھا مسرت سے چیخا۔

آنے والوں نے لمبے چوڑے آرے کو درخت کی جڑ سے لگایا اور دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں کھڑے ہو گئے۔ پھر انہوں نے ایک نعرہ لگایا اور ارا چلنے لگا۔ آرے کی تیز دھار درخت کو تیزی سے کاٹنے لگی۔ وہ ایک طرف جھکنے لگا۔ پُر اشتیاق چہرے چاروں طرف سے گھیرا ڈالے جھک جھک کر درخت کو کٹتے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے گلنار تھے۔ مگر وہ جو نہتے تھے اور درخت کو کٹنے سے بچا رہے تھے دیوانوں کی طرح اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھا رکھے تھے تاکہ درخت کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیں، اپنے شانوں پر سنبھال لیں اور اسے زمین پر گرنے نہ دیں۔ درخت تیزی سے ایک طرف جھک رہا تھا اور وہ بڑی تعداد میں اس کے نیچے جمع ہو رہے تھے کہ درخت گرنے نہ پائے اور خیر و برکت کا چشمہ خشک نہ ہو جائے۔

آخر کار درخت ایک دھماکے کے ساتھ گر پڑا اور ایک لمبی چیخ بلند ہوئی۔

''او ہو یہ چیخ کیسی تھی؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''شاید یہ درخت کی چیخ تھی!'' بوڑھا بولا ''اس بھیانک عفریت کی آخری چیخ!''

''نہیں!'' اس نے کہا ''یہ ان ہزاروں انسانوں کی چیخیں تھیں جنہوں نے اس کے نیچے پناہ لی تھی اور آج اسے گرنے سے بچاتے ہوئے اس کے نیچے دب کر فنا ہو گئے۔''

''منحوس درخت!'' بوڑھے نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا ''کمبخت گرتے گرتے بھی ہزاروں جوانوں کو کھا گیا۔''

لیکن گاؤں والوں کو درخت کے نیچے دب کر ہلاک ہونے والوں سے کوئی مطلب

نہ تھا۔ وہ آپس میں گلے مل رہے تھے۔ یوں جیسے عید کے دن ملتے ہیں۔ انہوں نے پڑوس کے گاؤں سے آنے والوں کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا تھا۔ ایک ہجوم تھا جو بڑی دھوم سے تیز دھار والے آلے کو چوم رہا تھا جس نے برسوں پرانے اور تناور درخت کو آن کی آن میں زمین بوس کر دیا تھا۔ ہجوم خوشیاں مناتا، نعرے لگاتا گاؤں کی سمت بڑھ گیا۔

آؤ اب واپس چلیں!'' اس نے بوڑھے سے کہا'' درخت تو کٹ گیا''

''نہیں وہ اب بھی موجود ہے'' بوڑھا تشویشناک لہجے میں بولا'' یہ دیکھ رہے ہو۔ درخت درمیان سے کٹا ہے اور اس کی جڑیں پوری طرح ہماری زمین میں پیوست ہیں۔ ہماری دھرتی کا رس پی کر یہ پھر سر اٹھائے گا۔''

''تو پھر؟''

''کچھ نہیں۔ کل کیا ہوگا یہ سوچنا ہمارا کام نہیں!''

عورت بوڑھے کی جھونپڑی کے دروازے پر دیر سے اُن کی منتظر تھی۔ انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھاس کے تنکوں کو اپنے کپڑوں سے جھاڑتے ہوئے بولی۔

''ہماری منزل یہی ہے نا؟''

''نہیں فریب منزل!'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''تمہاری تھکن دور ہوگئی ہوگی آؤ اب چلیں!''

''آگے؟'' عورت چیخ اٹھی'' اب کہاں؟''

''کیا پتہ!''

''تو گویا اب ہم بھٹکتے رہیں گے!''

''شاید!'' وہ بولا اور عورت کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔

بوڑھا اپنی دہلیز پر خاموش کھڑا انہیں جاتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

واپسی

برسوں بعد آج ایک بار پھر وہ اپنی جانی پہچانی گلیوں میں کھڑی تھی۔

وہی دَر و دیوار پر اُگتا ہوا سبزہ، وہی روئے آب پر کائی کا سماں، نیلے آسمان کے نیچے سیاہ بادلوں کا شامیانہ تنا ہوا، وہی کیچڑ اور پانی سے لَت پَت گلیاں جن میں ہوش سنبھالنے سے لے کر جوانی تک کی منزلیں اس نے طے کی تھیں۔ آم اور کٹھل کے ان ہی جھومتے درختوں اور کیلے کے باغوں کے درمیان سے گزرتی وہ فراک اور جانگیہ پہنے اپنی سہیلیوں چمپا، رُمپا اُوشا اور شانو کے ساتھ اچھلتی کودتی اسکول جایا کرتی تھی۔

راستے کی ترتیب وہی آج بھی تھی جس کا ہر موڑ اور سارے پیچ وخم برسوں سے اُس کے حافظے پر نقش تھے۔ وہی لوہے کا پل اور اس پر سے گزرتی ہوئی ارجن کے دھنش کی سی

سڑک جس کے نقطۂ عروج پر لوہے کا پُل تھا جس کی ریلنگ پر آج بھی برسوں پہلے کے وہ خوفناک نعرے لکھے ہوئے تھے جن کو دیکھ کر وہ دہل جاتی تھی۔ پُل کی ڈھلوان ختم ہونے پر جہاں سے سڑک ہموار ہو جاتی ہے چاچا رحمو کی دکان آج بھی موجود تھی اور پچھم کی طرف جہاں سے سڑک کی چڑھائی شروع ہوتی ہے وہاں چاند میاں مودی اب بھی بیٹھا ہے جو اسکول جاتی اور واپس آتی بچیوں کو روک کو اُن میں کھٹی میٹھی گولیاں تقسیم کرتا تھا۔

پل کے دونوں طرف جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے مفلوک الحال لڑکوں کا گروہ آج بھی ویسی ہی میلی بنیان پہنے، رنگ رنگ کی تہمد باندھے جمع ہے۔ لڑکوں کا یہ گروہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ہر آنے جانے والے سائیکل رکشے اور ٹھیلے والوں سے دس دس پیسوں کے عوض انہیں پیچھے سے ڈھکیل کر پل کے نقطۂ عروج پر پہنچا رہا ہے جہاں سے دوسری طرف کے نشیب میں وہ پیڈل چلائے بغیر اتر جاتے ہیں۔ البتہ بعض کمزور رکشے والے اپنی سواری پر قابو نہیں رکھ پاتے اور اس تیزی سے ڈھلوان سے اترتے ہیں کہ حادثہ یقینی ہو جاتا ہے۔ رکشے اور ٹھیلے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں، سواریاں یا اناج کی بوریاں بکھر جاتی ہیں اور خود وہ بھی زخمی ہو جاتے ہیں لیکن اس کی انہیں پرواہی کب ہوتی ہے۔ وہ تو سواریوں کو کسی نہ کسی طرح انتہائی بلندی تک پہنچا دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ بلندی سے جب ڈھلوان کا سفر شروع ہوگا تو رکشے اور سواریوں کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو بس اپنی مزدوری وصول کرتے اور بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ پھر کوئی کسی ہوٹل میں گھس جاتا ہے، کوئی کسی دکان کے پٹرے پر ساتھیوں کے ساتھ جوا کھیلنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور کوئی بیڑی کے کش پر کش لگاتا خالی خالی نظروں سے خلا میں گھورتا نظر آتا ہے۔

اسی محراب نما پل کے ایک طرف شہید اللہ چاچا کا دواخانہ تھا جہاں کی دوائیں وہ اس وقت سے کھاتی آرہی تھی جب امی اسے دبوچ کر دوائیں کھلاتی تھیں۔ ذرا آگے دائیں جانب سردار صاحب کی ڈیکوریشن کی دکان تھی۔ دکانیں بیشتر بند تھیں لیکن ان میں اجنبیت کی جگہ اپنائیت کا احساس تھا۔ بڑے چاؤ سے وہ ایک ایک دروازے کو دیکھتی چلی جارہی تھی۔ تب

ہی اسے چودھری چاچا کا مکان نظر آیا جس کے دروازے ہمیشہ کی طرح آج بھی کھلے تھے، جیسے کسی تھکے ہارے کو اپنی آغوش میں پناہ دینے کو بے قرار ہوں۔ تلخ و شیریں یادوں کے گھونٹ پیتی وہ جلدی سے چودھری چاچا کے گھر میں داخل ہوگئی۔

چودھری چاچا کے گھر میں آج بھی سب کچھ ویسے ہی تھا۔ چاچی جاموکی جوئیں دیکھ رہی تھیں، نرگس کوئی کتاب کھولے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی، پاس ہی رحمان صاحب اور محی الدین صاحب کی بیویاں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر سب ہی حیرت زدہ رہ گئیں۔ وہ دوڑ کر نرگس سے لپٹ گئی۔ یوں جیسے اب کبھی جدا نہ ہوگی۔ پھر وہ یوں روئی جیسے بوڑھی گنگا کا سارا پانی اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا ہو۔ نرگس نے اسے خود سے الگ کر کے صوفے پر بٹھایا اور پھر چاچی نے جیسے ساری ہمتوں کو سمیٹ کر بڑی حیرت سے پوچھا۔

''بٹی تم؟ کیسے آئیں؟''

''میرا دل وہاں نہیں لگتا چاچی۔ اس بھیگی سیاہ مٹی کو جس میں میرا وجود پلتا رہا ہے کس طرح چھوڑ دوں؟'' وہ جیسے پھٹ پڑی ''اسی دھرتی میں میرے ماں باپ کا خون جذب ہو چکا ہے، میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں؟''

سب اسے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے اور وہ جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔

''یہ زمین سوتے جاگتے مجھے بلاتی رہی ہے، مجھے اشارے کرتی رہی ہے۔ میری روح تو شاید اتنے عرصے ان ہی گلیوں میں بھٹکتی رہی ہے۔'' اس نے چودھری چاچا کو دیکھا جو خاموشی سے اسے تک رہے تھے۔

''چاچا تم نے تو مجھے گلیوں میں چلتے پھرتے ضرور دیکھا ہوگا؟''

چودھری چاچا اس اچانک بے تکے سوال سے گڑبڑا گئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے ''اب یہاں تمہارا کچھ نہیں ہے بٹی!''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ تڑپ اٹھی ''یہاں آپ ہیں، نرگس ہے، چاچی ہیں، میرا گھر ہے اور وہ زمین ہے جس نے مجھے سیراب کیا ہے۔ اس کے سوا کہیں میرا ٹھکانا

نہیں ہے۔''

پھر وہ بولتی ہی چلی گئی۔ وہ سب کچھ انہیں بتا دیا جو اس پر گزری تھی۔

چودھری چاچا ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر چاچی اٹھی اور اسے اندر کمرے میں لے گئی جہاں سامنے کی دیوار پر ٹیگور کی قد آدم تصویر آویزاں تھی جس کے گرد تازہ پھولوں کی نالا لپٹی تھی۔ وہ اس گھر کی تمام جزئیات سے آشنا تھی۔ پہلے اس جگہ نذرل کی تصویر ہوا کرتی تھی۔ دوسری طرف کی دیوار پر ایک کھونٹی سے قرآن پاک لٹکا ہوا تھا جس کے جزدان کا اصل رنگ گرد کی موٹی تہہ کے نیچے دب گیا تھا۔

آنکھیں بند کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی اور اپنے اس لمبے سفر کے بارے میں سوچنے لگی جس کی ایک ایک منزل اور ایک ایک موڑ پر اسے شدید ذہنی کرب سے گزرنا پڑا تھا۔ گزشتہ برسوں کے واقعات اس کے حافظے پر نقش تھے۔ والدین کی اپنے ہی گھر کے آنگن میں شہادت اور پھر وہاں سے نکل کر ہزاروں میل دور اپنے بھائی کے گھر تک کا سفر۔ وہ بے آب وگیاہ۔ سرزمین، آگ برسانے والا سورج، خلوص اور محبت کی نمی سے محروم ریتلی مٹی، اپنوں کا رحم اور مروت سے عاری سلوک، اسے سب کچھ اپنی مکمل جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ سینے میں زخم ڈالتے ہوئے زہریلے فقرے، اپنوں ہی نے اس کی زبان اور لب و لہجے کا مذاق اڑایا، اس کے طور اطوار پر خوب ہنسے، اسے کوتاہ اندیشی کے طعنے دیے۔ البتہ کسی نے یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اور اب کیا ہوگا؟ کون اُس کے سر پر ہاتھ رکھے گا۔ کون یہ بتائے گا کہ جو کچھ ہوا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ بھلا اپنا گھر اپنے ہاتھوں کون اجاڑتا ہے۔ اپنے آشیانے میں خود بھی کسی نے آگ لگائی ہے۔

لیکن دوسری طرف تو لوگ اپنی خوش بختی پر نازاں تھے۔ سجدۂ شکر بجا لا رہے تھے کہ وہ اپنے ادھر کے عزیزوں کی بدبختی سے محفوظ رہے کتنے اپنی دور اندیشی پر نازاں تھے۔ وہ اگر وہاں ہوتے تو ہوا کا رخ پہچانتے۔ لٹیروں اور قاتلوں کا ساتھ دیتے۔ ٹرینیں اڑاتے، بم دھماکے کرتے اور مزے کرتے کیونکہ دور اندیشی کا یہ تقاضا تھا، وہ سوچتی اور کڑھتی، اتنے

عرصے اس نے کڑھنے کے سوا کیا ہی کیا تھا۔

اسے وہ دن بھی یاد آئے جب بھائی بھاوج نے ایک خداترس صاحب سے بیاہ کر اسے اپنے گھر سے یوں رخصت کیا جیسے کباڑی کے ہاتھوں ردی فروخت کی جاتی ہے۔ ایک طرف ایک مجروح اور زخم خوردہ احساسات کی شخصیت اور دوسری طرف کار خیر اور ثواب دارین کے تمغے سجائے دولہا میاں۔ دو کمروں کے فلیٹ میں اس کے زخموں پر مرہم رکھنے والا کوئی نہ تھا۔

نئے گھر میں اپنی غیر معیاری زبان کی وجہ سے لوگوں سے ملنے جلنے سے گریز کرتی۔ سارا دن وہ ننگے پاؤں دو کمروں کے فلیٹ میں چلتی اور بار بار لپک کر بالکونی پر چلی جاتی جیسے کمرے میں اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ پنجرے میں بند پرندے کی طرح وہ دور خلاؤں میں تکتی رہتی۔ امنڈتی گھٹاؤں، لہراتے سیاہ بادلوں اور پدما اور سرما کے ٹھنڈے پانیوں کو آواز دیتی۔ دھان اور پٹ سن کے ہرے بھرے کھیت، بانس کے لہلہاتے جنگل ہزاروں میل دور سے اسے آواز دیتے۔ مٹی اور کیچڑ سے لتھڑی گلیاں اسے اپنی طرف بلاتیں اور عروس البلاد اسے کھولتا جہنم نظر آتا جہاں ہفتوں وہ کسی خوش رنگ چڑیا کا نغمہ سننے کو ترستی۔ کیچڑ بھرے تالاب میں کھلتے کنول دیکھنے کو بے قرار رہتی۔

وہ پہروں آنے جانے والوں کی نظروں سے بے نیاز بالکونی میں کھڑی رہتی۔ اس کی سہیلیوں کے سائے رنگ رنگ کی ساڑیوں میں ملبوس اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہتے۔ اپنے گھر کے صحن میں لیٹے ہوئے ابو کے سر میں وہ تیل مالش کرتی، یونیورسٹی کی راہداری میں کھڑی سامنے بہتی ندی میں ابھرتی، ڈولتی کشتی کے ہچکولوں کا لطف اٹھاتی۔ ہرے بھرے کھیتوں، آم اور کٹھل کے باغوں اور کیلے کے سبز پودوں کے درمیان سے گزرتی، درختوں کے گھنے سرمئی سایوں میں چلتی اور ٹھنڈی ہواؤں میں اس کا آنچل موجوں میں ڈولتی کشتی کے بادبان کی طرح لہراتا۔

اور پھر جب اس کا شوہر اسے جھنجھوڑ کر بتاتا کہ یوں بے مقصد بالکونی میں کھڑے

رہنا بری بات ہے تو اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ ایک بار پھر وہ جہنم میں لوٹ آتی جہاں لق و دق صحرا اور سراب کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر طرف پیاس ہی پیاس تھی اور آبِ حیات کا دور دور پتہ نہ تھا۔ وہ ایک آہ بھر کر گھر کے کاموں میں لگ جاتی لیکن اس کی روح اپنے محلے کی گلیوں اور گھر کی راحت بخش فضاؤں میں بے قرار پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتی رہتی۔

صدمہ اس بات کا تھا کہ دوسروں کی طرح اس کے شوہر نے بھی اسے پاگل کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی باتیں پاگل پن کی ہی باتیں تو تھیں۔ وہ دریاؤں، بادلوں اور سبزہ زاروں کے دیس میں واپس جانا چاہتی تھی۔ فوم کے صوفوں کی جگہ گیلی مٹی کے فرش پر بیٹھنا چاہتی تھی، اونچی ایڑی کے سینڈل چھوڑ کر ننگے پاؤں چلنا چاہتی تھی۔ آخر کار ایک دن وہ اُس پاگل خانے سے نکل بھاگی جہاں اُسے پاگل سمجھا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی ساری پونجی ایک ایسے آدمی کو سونپ دی جو اس جیسے لوگوں کو ان کے وطن پہنچایا کرتا تھا۔

تیسرے پہر جب وہ سو کر اُٹھی تو ہر طرف اداسی تھی۔ چودھری چاچا کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنی دہلیز چومنے نکل کھڑی ہوئی۔ میکے کی وہ چوکھٹ جسے چومنے کی خواہش ہر سہاگن کو ہوتی ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے چاچی اور نرگس نے اسے خبردار کیا۔

''اپنے گھر کی طرف نہ جانا بیٹی۔ ادھر خطرہ ہے۔''

لیکن وہ بے تابانہ نکل کھڑی ہوئی۔ اسی وقت سردار صاحب کی دکان سے شاہ جہاں نے اسے دیکھا۔ اور ابھی وہ حیرت سے کھڑا کچھ پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ دو چار متجسس نوجوان جمع ہو گئے۔

''یہ لڑکی کون ہے؟'' انہوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا۔ ابھی وہ اسے گھیرنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ وہ سامنے والے دکان کے بازو والی گلی میں جا گھسی۔ وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے ادھر پہنچنے ہی والے تھے کہ سامنے ڈھاکیشوری اسکول کی عمارت دیکھ کر وہ اس کے برابر والے مکان میں داخل ہو گئی جہاں ہیڈ مسٹریس رہتی تھیں۔ یہ وہی خاتون تھیں جنہوں نے چار سال کی عمر میں اسے اپنے اسکول میں داخل کیا تھا اور وہیں سے اس نے

میٹرک کیا تھا۔ وہ امی سے ہمیشہ اس کی تعریفیں کیا کرتی تھیں۔ اس بات نے اسے سہارا دیا اور وہ باورچی خانے کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ ابھی وہ خود کو سنبھالنے بھی نہ پائی تھی کہ دو مسلح افراد گھر میں داخل ہوگئے۔ وہ رضیہ آپا کو پکارتی ہی رہ گئی لیکن ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اسی وقت ایک آدمی لپک کر آگے بڑھا ہی تھا کہ وہ بھاگ کر سامنے والی کوٹھری میں گھس گئی اور دوسری طرف کا دروازہ کھلا پا کر پیچھے باغ میں نکل گئی۔ کچھ دیر بعد جب ذرا سناٹا ہوا تو رضیہ آپا نے اسے سمجھایا کہ اس کی وجہ سے لوگ اُن کی بیٹی کی عزت کے درپے ہو جائیں گے۔

رضیہ آپا کے انکار پر ایک بار پھر وہ سڑک پر آگئی۔ سامنے اس کا اپنا گھر تھا۔ گلی میں مسلح پہرے دار گھوم رہے تھے۔ شدید مایوسی کے عالم میں اسے تارا کی دوستی یاد آئی اور وہ دوسری طرف سے ہو کر تارا کے گھر چلی گئی۔ تارا اسے دیکھ کر حیرت اور تشویش سے کانپ اٹھی اور پھر اسے گلے لگا لیا۔ تارا سے اسے اپنے مکان پر روشن میاں کے قبضے کا علم ہوا۔ روشن کبھی اس کے مکان کی بالائی منزل میں اس کا کرایہ دار ہوا کرتا تھا۔ اپنی قابلِ اعتراض نجی زندگی کے باوجود اسے شریف آدمی سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ اپنی پڑوسی گمراہ لڑکیوں کو محلے کے آوارہ لڑکوں سے بچانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اپنے گھر پر روشن علی کے قبضے کا حال سن کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد گلی جب ذرا سنسان ہوئی تو وہ اپنے گھر میں داخل ہوگئی۔

اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بڑی خاموشی سے دبے پاؤں وہ اپنے گھر میں یوں چل رہی تھی جیسے کسی زیارت گاہ میں چل رہی ہو۔ سامنے صحن میں اس کی امی کی نشست گاہ تھی جہاں شام کو اس کی امی فرش پر گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہوتیں۔ اطراف میں ان کی سہیلیاں ہوتیں۔ مراد آبادی پاندان کھلا ہوتا اور بنگال کے خستہ پان کی گلوریاں بن رہی ہوتیں۔ محلے بھر کے مسائل کا ذکر ہوتا۔ اس نے بڑی عقیدت سے اپنی ماں کے بارے میں سوچا۔ پھر نظریں چھت کی طرف اٹھ گئیں جہاں اس کا اور بہن بھائیوں کا پالنا لٹکایا جاتا تھا۔ رسی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اب بھی چھت سے لٹک رہے تھے لیکن اب وہاں کوئی پالنا نہ تھا۔ ان میں پلنے والے بچے اس کے اور بڑے بھیا کے سوا سب آسودۂ خاک ہو چکے تھے۔

اسے پالنے کی ڈوری ہلانے والی سفید بالوں اور رعشہ دار ہاتھوں والی فاطمہ ماں یاد آئی جواب نہ جانے کہاں ہوگی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک بار پھر ننھی سی بچی بن جائے اور فاطمہ ماں کے بوڑھے سینے سے لگ کر امی کی ڈانٹوں سے محفوظ ہو جائے۔ آج تو گھر میں نہ امی ہیں اور نہ فاطمہ ماں جو دنیا کی ظالم نگاہوں سے اسے محفوظ کر لیتیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی چیخ اٹھے۔

''فاطمہ ماں! فاطمہ ماں، کوتھائے آشو، کوتھا سنو نہ کینو؟'' مگر اب وہاں آواز دینے والا کون تھا۔

سامنے صحن میں موتیا اور گلاب کی کیاریاں بدستور موجود تھیں۔ وولن چمپا اور گندھوراج کے پودے آج بھی لہلہا رہے تھے۔ بنگال کی مہربان زمین اور بادلوں سے ڈھکا آسمان ایک شفیق ماں کی طرح ان پر اپنے آنچل کا سایہ کیے انہیں مرجھانے سے بچائے ہوئے تھا لیکن وہ پُر شوق ہاتھ اب کہاں تھے جنہوں نے بڑے ارمانوں سے یہ پودے لگائے تھے۔ صحن کے دوسری طرف اس کا اپنا کمرہ تھا جس کی کھڑکیاں لان میں کھلتی تھیں۔ کھڑکیوں سے گلاب کی زرد اور سفید کلیاں آج بھی نظر آ رہی تھیں اور اس سے سوال کر رہی تھیں کہ وہ واپس آئی کیوں۔ دوسری طرف امی کی نشست کے پیچھے ابا کا کمرہ تھا جس کی کھلی کھڑکی پر ایک کوا بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا گویا اسے مسلسل ڈانٹ رہا تھا۔ ''تم کیوں آئی ہو۔ بتاؤ اس گھر سے اب تمہارا کیا رشتہ ہے؟''

نیچے تخت اور فرش کی جگہ پرندوں کی بیٹ بکھری تھی۔ روشندانوں میں چڑیوں کے گھونسلے تھے جن سے گھاس پھوس اور پھٹے پرانے چیتھڑے گر کر نم آلود ہواؤں سے ادھر اُدھر خاک میں رُل رہے تھے۔ وہ ایک ستون سے لگی کھڑی تھی اور اپنے راحت کدہ کے بام و در کو حسرت سے تک رہی تھی۔ اس گھر کے چپے چپے پر اس کے قدموں کے نشان اور اس کے وجود کی مہریں لگی تھیں۔ دیواروں پر پنسل سے لکھے بہن بھائیوں کے نام آج بھی باقی تھے۔ دیواروں پر لکھنے کی عادت پر اُسے بارہا ڈانٹ پڑی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ آج وہ پھر کسی دیوار

پر کچھ لکھے اور امی باورچی خانے سے نکل کر اسے ڈانٹنا شروع کر دیں۔

تب ہی دروازے پر آہٹ ہوئی اور روشن علی گھر میں داخل ہوا۔ یہ وہی روشن علی تھا جس نے ایک بار بیساکھی کے میلے میں جب اچانک طوفان آ جانے سے وہ بھیڑ میں کھو گئی تھی اور ابو کا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا تو اسی نے اسے پہچانا تھا اور پھر گود میں اٹھا کر گھر پہنچا دیا تھا۔ زندگی کے ہنگاموں اور طوفان کی زد میں آ کر آج وہ پھر سب سے بچھڑ کر ماری ماری پھر رہی تھی کہ روشن علی سامنے آ گیا۔ پر اب وہ اسے کہاں پہنچائے گا؟

اس نے پلٹ کر روشن علی کو دیکھا جو بڑی حسرت اور تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم اس گھر میں رہنا چاہتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔ چودھری چاچا نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

''ہاں!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''لیکن اب یہ ممکن نہیں ہے'' روشن علی نے جواب دیا۔ اس نے اسے چودھری چاچا کے گھر چھپ کر رہنے کا مشورہ دیا۔

''آؤ شام سے پہلے میں تمہیں وہاں پہنچا دوں'' وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔

''تم جانتی ہو گی کہ میں ایک بدنام آدمی ہوں۔ تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔''

وہ چپ چاپ سر جھکائے اس کے پیچھے چل پڑی۔ بڑی حسرت سے مڑ کر اس نے اپنے گھر کو دیکھا جس کے فرش پر اس کے والدین کا خون رچا ہوا تھا۔ اسی گھر کی بالکونی سے وہ سڑک پر سے نعرے لگاتے ہوئے گزرتے جلوسوں کو دیکھا کرتی تھی۔ یہیں سے اس نے ہر طرف سے شعلے اٹھتے دیکھے تھے اور فریاد و فغاں کا شور سنا تھا۔ اسی وقت گلی سے گزرتے مسلح رضا کاروں نے اسے ٹھہرنے کا حکم دیا۔ روشن علی نے اسے اپنے پیچھے کر لیا۔ اِدھر اُدھر سے کئی جوان نکل آئے۔

''اس عورت کو ہمارے حوالے کر دو'' کسی نے حکم دیا۔

''یہ عورت میری بہن ہے۔'' روشن علی نے ڈپٹ کر جواب دیا اور جیب سے

ریوالور نکال لیا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے ایک دوسرے کو اشارے کیے اور اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ وہ پھر چل پڑی۔ ابھی وہ سڑک پر آئے ہی تھے کہ ایک فائر ہوا اور روشن علی نے دھکا دے کر اسے ایک طرف کر دیا۔ فائر کرنے والے کو ایک گندی سی گالی دی اور غصے سے سرخ ہو گیا۔

اب وہ سڑک پار کر کے ''شانتی کنج'' کی طرف جا رہے تھے کہ ایک فوجی ٹرک نے ان کا راستہ روک لیا۔ فوجی ٹرک سے نیچے اترے اور ان کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں کمینگی اور سفلہ پن ابھر ایا تھا۔ وہ گھبرا کر روشن علی سے چپکی جا رہی تھی۔ روشن علی کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا جو فوجی کارروائی کے وقت بھاگ کر پڑوسی ملک میں جا چھپا تھا اور اپنے اس کارنامے پر محبِ وطن قرار پایا تھا۔ چنانچہ تھوڑی بحث و تکرار کے بعد وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔

روشن علی کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ نہ جانے کیوں وہ سخت تشویش میں مبتلا نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ مجمدار صاحب کے گھر میں داخل ہوئے جہاں دیر تک صلاح و مشورے کے بعد روشن علی کو بتایا گیا کہ یہ لڑکی ہم میں سے نہیں۔ اگر اس کو یہاں رہنے دیا گیا تو آزادی خطرے میں پڑ جائے گی اور ساری قربانیاں ضائع ہو جائیں گی۔ روشن علی بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے بسی، خجالت اور غصے کے ملے جلے جذبات کی کشمکش صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ اسے بتایا جا رہا تھا کہ اس لڑکی کو پناہ دینے والا خود عتاب کا شکار ہو جائے گا۔

روشن علی چپ چاپ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا گلی میں نکل آیا۔ پھر باری باری سے اس نے کئی دروازے پر دستک دی۔ وہ اس کے پیچھے یوں چل رہی تھی گویا صدیوں سے اسی طرح چلتی آئی ہو۔ محلے کا ہر شخص اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ ہر گھر کی لڑکیاں اس کی سہیلیاں تھیں۔ آج وہ اسے یوں دیکھ رہی تھیں گویا زندگی میں پہلی بار دیکھا ہو۔ ان کے چہروں پر ناگواری کے جذبات صاف جھلک رہے تھے۔ نفرت، شدید نفرت اور اس سے جو اُن ہی کے درمیان پلی بڑھی اور آج اپنے اس گھر میں آباد ہونے کا حق مانگ رہی تھی جو اس کے والدین کی میراث تھا اور جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔

شام سر پر آ گئی تھی اور روشن علی کو ہر گھر سے ایک ہی جواب مل رہا تھا۔ یہ لڑکی ہم میں سے نہیں ہے۔ روشن علی کا چہرہ اُمید اور نا اُمیدی کی کشمکش سے دھواں ہو رہا تھا۔ وہ ایک ضدی آدمی تھا اور اپنی بات منوانے کا عادی تھا۔ آج وہ اس لڑکی کو اپنا حق دلوانے پر تُل گیا تھا۔ محلے والوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں ناکام ہو کر وہ اپنے گودام کی سمت چل پڑا کہ رات وہ لڑکی کو وہیں بند کر دے گا اور صبح کوئی تدبیر کرے گا۔ وہ لڑکی جو اس کے سامنے پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور آج اس کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ اسے خود ساختہ فوجیوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کلکتہ میں ایسی لڑکیوں کا حشر دیکھا تھا۔ وہ اس کو برباد ہوتے دیکھنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہا تھا۔

روشن علی وہی تو تھا جس نے ہنگاموں کے ابتدائی دنوں میں جب اس کا گھر بار لٹ گیا تھا اور عزیز رشتہ دار شہید ہو گئے تھے تو اسے اپنے گھر لے جا کر رکھا تھا اور پھر اسے اس کے بھائی کے پاس کراچی بھیج کر خود اس کے گھر پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن اب جب وہ واپس آ گئی تھی تو اسے غنڈوں اور بھیڑیوں کے حوالے کرنے کے تصور سے اسے شدید اذیت ہو رہی تھی۔ وہ دو گھنٹے سے اسے اپنے ساتھ لیے لیے پھر رہا تھا۔ ایک ایک دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس کے اندر انسان اور حیوان کے درمیان شدید کشمکش ہو رہی تھی۔

اور آخر کار جب وہ اپنے ڈپو پر پہنچا تو کانپ اٹھا۔ خود ساختہ فوجیوں کا ٹرک وہاں پہلے سے موجود تھا۔ محلے والوں نے روشن علی کے ساتھ ایک غیر لڑکی کی موجودگی کی اطلاع انہیں پہلے ہی دے دی تھی۔ ٹرک کے قریب ہی چودھری چاچا کھڑے تھے۔ فوجیوں کو دیکھ کر اس نے بڑی بے بسی سے روشن علی کا بازو پکڑ لیا۔

''اب کیا ہوگا روشن بھائی؟'' اس کی دہشت دیکھ کر روشن علی کے اندر کا انسان جاگ اٹھا۔

''ڈرو نہیں!'' وہ آہستہ سے بولا۔ وہ کسی قطعی فیصلے تک پہنچ گیا تھا۔ بڑی نرمی سے اس نے سہمی ہوئی لڑکی کا ہاتھ اپنے بازو سے الگ کیا اور پورے اعتماد سے افسر سے مخاطب ہوا۔

''اس لڑکی کو نہ تو میں جیل بھیج سکتا ہوں اور نہ آپ کے حوالے کر سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے'' آفیسر بولا ''تم ابھی اس کو اپنے پاس رکھو پھر ظہور میاں، شمسو میاں اور آنند بابو کے حوالے کر دینا۔ سب سے پہلے ان ہی لوگوں نے ہمیں اطلاع دی تھی۔''

''کیا کہہ رہے ہیں؟'' روشن علی چیخ اٹھا ''اس لڑکی کو میں نے واپس بلوایا ہے اور آج ہی میں اس سے شادی کر رہا ہوں۔ یہ اسی دھرتی کی بیٹی ہے۔''

سب کی نظریں جھک گئیں۔ وہ جو ایک غیر لڑکی کی رسوائی کا تماشا دیکھنے آئے تھے ان کے منہ لٹک گئے۔ فوجی بڑی ناگواری کے ساتھ اپنے ٹرک پر سوار ہوئے اور ٹرک ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ روشن علی نے چودھری چاچا کو حقارت سے دیکھا اور پھر ایک ایک چہرے کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑی۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ باہر اس کا شوہر جانے کب سے اسے آوازیں دے رہا تھا۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھتی ہوئی وہ اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ کراچی کی گرم اور جھلسا دینے والی ہوا کے ساتھ ہی پسینے میں ڈوبا ہوا اس کا شوہر اندر چلا آیا۔ گرم لُو کے تھپیڑوں نے اسے خواب کی دنیا سے تلخ حقیقتوں کی دنیا میں گھسیٹ لیا تھا۔

☆☆☆

آئینے کا آدمی

''کیا کہا؟ آئینے میں تمہیں اپنے بجائے وہ نظر آتا ہے؟''

یہ سوال کرتے ہوئے جینٹ کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کچھ اور بھی کھل گئیں۔

وہ دونوں اسٹرٹیجن آئی لینڈ جانے والی فیری کے انتظار میں دیر سے بیٹھے تھے۔ دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے۔ رسمی تعارفی جملوں کے تبادلے کے دوران چند مشترک باتوں کے انکشاف نے جینٹ کو اس میں دلچسپی لینے پر اکسایا تھا۔ دونوں کو ایک ہی جاب کے لیے انٹرویو کال ملی تھی۔ دونوں نے ساتھ ہی ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے دفتر میں فارم پُر کیے تھے اور پہلی بار انٹرویو face کرنے کے تجربے سے گزرنے جا رہے تھے۔ دونوں کو ایک ہی دفتر میں ایک ہی جاب کے لیے انٹرویو دینا تھا۔ اتفاق سے دونوں نے اسی سال الگ الگ اسکولوں سے گریجویشن کیا تھا۔

جینٹ انتہائی حیرت سے اس بھولے بھالے لڑکے کو دیکھے جا رہی تھی جس نے اپنے ماضی کے بارے میں اسے بتاتے ہوئے یہ حیران کن بات کہی تھی۔ اس سے پہلے وہ اپنی سیدھی سادی کہانی سنا چکی تھی جو اس کے معاشرے کی بیشتر لڑکیوں کی کہانی تھی۔ اس نے اس کے قریب سرکتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر میں اس سے سوال کرتا ہوں کہ اگر یہ تم ہو تو میں کہاں گیا اور اگر یہ میں ہوں تو تم کہاں سے آ گئے؟ سارا سارا دن اسی سوال میں الجھا رہتا ہوں۔'' اس نے بڑی اداسی سے کہا۔ چہرے پر پھیلے ہوئے دکھ کے سائے نے اسے کچھ اور معصوم سا بنا دیا تھا۔

اسی وقت شدید ترحم کے ایک لمحے نے جینٹ کو بے ساختہ اس سے اور قریب کر دیا۔ اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔

''تم بتا رہے تھے کہ تم نے اسے کبھی نہیں دیکھا ہے اور ماں کو کبھی بتانے کی فرصت نہیں ملی پھر اس کی شکل......''

''یہ بات مجھے گرینی نے بتائی۔'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''جمعہ کی رات سے لے کر اتوار کی شام تک کے لیے مجھے گرینی کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔ وہ مجھے اکثر بتاتی تھی کہ میں بالکل اپنے باپ کی طرح ہوں۔ ویسے ہی ذرا اوپر کو اُٹھے ہوئے نتھنے، چوڑا چہرہ اور چھوٹے کان، ابھرا ہوا سا ماتھا۔ بالوں کا گرتا ہوا اسٹائل۔ بچپن سے میں آئینہ دیکھتے دیکھتے اپنے آپ کو اسی روپ میں ڈھلتا دیکھتا ہوں۔'' ایک لمحے کو وہ کھو سا گیا۔ جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''مجھے یاد ہے جب ماں کی انگلی تھامے میں گھر سے اسکول جا رہا ہوتا یا شاپنگ مال میں گھوم رہا ہوتا اور میرے جیسے بہت سے بچے اپنے باپ کا یا ماں باپ دونوں کا ہاتھ تھامے آس پاس سے گزر رہے ہوتے تو میں اپنا دوسرا ہاتھ ایک بڑے سے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں

محسوس کرتا تھا۔تم یقین کرو میں اپنے ہاتھ میں اس کی گرمی بھی محسوس کرتا تھا......''

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اس نے بے اختیار جینٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔جینٹ نے اپنا ہاتھ اس کے دوسرے شانے تک پھیلا کر پیار سے اسے تھپکی دی۔

''اتوار کی شام کو گرینی کے گھر سے واپس لاتے ہوئے میری ماں مجھے راستے میں پڑنے والے پارک میں لے جاتی۔وہ اور اس کا بوائے فرینڈ جو اس کے ساتھ ہوتا تھا کسی بینچ پر بیٹھ جاتے۔مجھے یاد ہے کہ میں ہمیشہ اپنے پسندیدہ سلائڈ اور جھولے کی طرف بھاگتا تھا۔وہاں سب بچے اپنے ماں باپ کے ساتھ انجوائے کرتے تھے۔بلکہ اب مجھے یوں لگتا ہے کہ ان کے ماں باپ انہیں انجوائے کرتے تھے۔وہ انہیں سلائڈ پر چڑھنے میں مدد کرتے اور جب وہ پھسل کر نیچے آتے تو وہ دوڑ کر دوسری طرف آتے اور انہیں زمین تک آنے سے پہلے تھام لیتے تھے اور کبھی قہقہے لگاتے ہوئے اچھل کر آہستہ سے نیچے اتار دیتے۔وہ پھر آگے پیچھے دوڑتے ہوئے سلائڈ کی طرف شور مچاتے ہوئے جاتے یا پھر جھولے پر جا بیٹھتے اور باپ لمبی لمبی پینگیں دیتا۔جھولے کے اوپر جاتے اور نیچے آتے وقت دونوں زور زور سے گاتے اور ہنستے۔

Up Up The Swing High

Low Low The Swing Down.

دونوں کی آوازیں اور قہقہے دوسری آوازوں کے ساتھ گونجتے رہتے۔جھولے سے اتر کر بچے کبھی باپ کے کاندھوں پر چڑھ جاتے،کبھی گلے میں جھول جاتے اور باپ انہیں سینے سے چمٹا کر بڑے والہانہ انداز سے My Honey, My Sunny اور My sweet heart جیسے الفاظ ادا کرتے ہوئے انہیں پیار کرتا......'' وہ رک رک کر کچھ سوچنے لگتا۔

''اور پھر کیا ہوتا؟'' جینٹ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''پھر میں خود کھیلنا بھول کر ان مناظر میں گم کھڑا رہتا۔اسی وقت نہ جانے کیوں مجھے آئینے کا وہ عکس ایکدم سے یاد آ جاتا اور ساتھ ہی دور درختوں کے جھنڈ میں آئس کریم

ہاتھوں میں لیے باتوں میں منہمک مجھے میری ماں اور اس کا بوائے فرینڈ نظر آ جاتے۔ جانے کیوں خود پر غصہ آنے لگتا اور میں زور زور سے رونے لگ جاتا۔

میری ماں جھلائی ہوئی آئس کریم کے گلاس کو ڈسٹ بن میں پٹختی ہوئی میری طرف جھپٹتی اور رونے کی وجہ پوچھتی۔ وہ کچھ سنے بغیر ہی مجھے بازو سے گھسیٹتی ہوئی گاڑی کی طرف چل پڑتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔

'تم ہمیشہ اسی طرح کرتے ہو۔' راستے بھر وہ مجھے ملامت کرتی۔ جوزی، رائل اور برٹ کی مثالیں دیتی۔ وہ گھر آتی اور رات کے کھانے کی تیاری اور دوسری مصروفیات میں لگ جاتی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور کھانے کے بعد اپنا پسندیدہ کارٹون شو دیکھے بغیر چپ چاپ بستر پر جا کر لیٹ جاتا۔''

''اچھا تو پھر؟'' جینٹ نے اس کے شانوں کو دوستانہ تھپکی دی۔

''پھر میرے تصور میں پارک میں کھیلتے دوڑتے باپ بیٹے ہی ہوتے تھے اور خواب میں تمام رات میں برٹ، رائلی، جوزی اور روکس کے ساتھ خود کو بھی اپنے باپ کی گود میں بیٹھ کر سرکل والے جھوٹے میں جھولتے، بازوؤں میں اٹھا کر ہوا میں اچھالنے، ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے بھاگتے، سوئمنگ پول میں ایک دوسرے کو گیلا کرتے، قہقہے لگاتے، پیار کرتے ہوئے، ''مائی سنی، مائی ڈارلنگ'' کہتے دیکھتا رہتا۔ صبح آنکھ کھلتے ہی روتے ہوئے اٹھنے پر ماں کی جھڑکیاں سنتا اور سارا دن اداس رہتا۔ کلاس میں بھی خواب کے مناظر میں کھویا رہتا۔ ٹیچروں کے سوالات کے الٹے سیدھے جواب دیتا۔ سارا ہفتہ اسی طرح گزر جاتا۔ پھر جمعے کی شام آ جاتی اور ماں مجھے گرینی کے پاس چھوڑ آتی۔''

''اور تمہاری رپورٹ کا کیا ہوتا تھا؟'' جینٹ نے اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

''وہ ہمیشہ کی طرح hopeless ہوتی۔'' اس نے کہا۔ ''اگلے سال اسکول والوں

نے میری تحلیل نفسی کرائی جس کے بعد رپورٹ تو ٹھیک ہوگئی لیکن آئینے میں وہ......''

جینٹ نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بڑے والہانہ انداز سے اس کی آنکھوں میں جھک کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔'' کیا اب بھی مجھ سے ملنے کے بعد بھی وہ نظر آتا ہے؟''

جواب میں اس نے اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیے۔ دونوں کے ہونٹ ملنے ہی والے تھے کہ فیری کی آمد کا سگنل بجا اور دونوں کھڑے ہوگئے۔

''اب وہاں ہم ٹیکسی سے جائیں گے۔'' جینٹ نے گرم سانسوں کے درمیان سرگوشی سی کی۔

دونوں گیٹ سے محبت کرنے والے امریکی جوڑے کی طرح برآمد ہوئے اور ٹیکسی میں آن بیٹھے۔

''۹۸۔اسٹریٹ اسٹریچن آئی لینڈ۔''

ٹیکسی والے نے اثبات میں سر ہلایا اور ٹیکسی چل پڑی۔ ایک گھنٹے کے اس سفر میں دونوں ایک دوسرے میں گم رہے۔ ٹیکسی والے نے ٹیکسی روکی۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ والٹ سے پیسے نکال رہا تھا کہ جینٹ نے اندر ہی سے بڑے بڑے حروف میں ڈرائیونگ سیٹ کی پشت پر لکھے نام پیری اسمتھ کو پڑھا اور اسے پکار کر کہا۔

''تم رونالڈ اسمتھ ،اس ڈرائیور کے بیٹے تو نہیں؟''

جینٹ کے منہ سے اپنا نام سن کر ڈرائیور نے بڑی بیتابی سے رونالڈ کی طرف دیکھا جو والٹ سے پیسے نکال کر گن رہا تھا۔ بڑے جوش سے اس نے ٹیکسی کا دروازہ بند کیا۔

''اوہ تو تم رونالڈ ہو۔ رونی میرے ننھے سے بیٹے۔'' رونالڈ نے ایک نظر ڈرائیور پر ڈالی۔ ایک لحظہ دیکھتا رہا پھر بڑی عجلت سے جینٹ کا ہاتھ پکڑا۔ دوسرے ہاتھ سے ڈرائیور کو کرائے کے پیسے تھمائے اور قدم آگے بڑھا دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور دیر تک وہاں کھڑا انہیں اس بیس منزلہ عمارت کے اندر کی بھیڑ میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔ ☆☆☆

جب آنکھ کھلی گُل کی

داخلے کے تمام مراحل سے گزر کر جب میں نے گھڑی دیکھی تو واپسی کی گاڑی آنے میں صرف پینتالیس منٹ باقی تھے۔ میں نے سرسری سی اداس نظروں سے چچا میاں کو دیکھا جو سچ مچ ''چرچل'' کی شان بے نیازی سے ہسپتال کے وارڈروں کی معیت میں خراماں خراماں گیلری میں چلے جا رہے تھے۔ بے چارے میرے چچا! ابھی چند مہینوں پہلے بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ ساتھ وہ بڑی حد تک میرے بھی کفیل تھے۔ مگر خدا جانے کیا ہوا کہ دماغی حالت رفتہ رفتہ خراب ہونے لگی۔ یہاں تک کہ گزشتہ چند ہفتوں سے تو وہ بالکل ہوش وحواس ہی کھو بیٹھے۔ خود کو چرچل کہتے اور طرح طرح کے اوٹ پٹانگ احکامات صادر کیا کرتے۔ پھر تقریروں کا طویل سلسلہ شروع کر دیتے۔ اور انجام کار ان کی شعلہ فشانی کا نتیجہ مار پیٹ پر ختم ہوتا۔ سارے محلے والے جمع ہو جاتے جب کہیں ان پر قابو پایا

جا تا۔ آہ! میرے شفیق چچا جنہیں لوگ باندھ دیا کرتے تھے۔ آخر کار ان کو اس دُور افتادہ شہر کے دماغی ہسپتال میں داخل کرنا ناگزیر ہوگیا۔ بڑی دشواریوں اور سفارشوں کے بعد کہیں داخلے کی اجازت ملی۔ خدا کرے جلد اچھے ہو جائیں، ہسپتال کے بڑے گیٹ سے نکلتے ہوئے میں نے بڑی فکر مندی سے سوچا، اب کیا ہوگا؟ ایک میری نوکری اور وہ بھی عارضی اور پھر صرف ڈھائی سو روپوں میں اتنے بڑے خاندان کی میں کب تک کفالت کرسکوں گی۔

گیٹ سے نکلتے ہی مجھے ایک رکشا مل گیا اور میں اپنے تفکرات میں ڈوبی ہوئی اسٹیشن کو جانے والی سڑک پر ہولی۔ تمام راستے مجھے اسٹیشن جلد پہنچنے کی فکر لگی رہی اگر گاڑی نہ مل سکی تو مجھے اس اجنبی شہر میں رات گزارنی پڑے گی۔ کیونکہ دوسری گاڑی کل آئے گی اور صبح مجھے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا ضروری تھا۔

خدا خدا کر کے اسٹیشن آ گیا۔ رکشے والے کو پیسے دے کر اپنا مختصر سا سوٹ کیس ہاتھ میں لیے جب میں پلیٹ فارم پر پہنچی تو گاڑی آ چکی تھی۔ میں لپک کر سیکنڈ کلاس کے ایک زنانہ ڈبہ میں سوار ہوگئی۔ اس بھاگ دوڑ سے میری سانس پھول رہی تھی۔ جلدی سے سوٹ کیس سامنے والی برتھ پر رکھ کر میں بیٹھ گئی۔ اس کے بعد ماحول کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ کمپارٹمنٹ نسبتاً خالی ہی تھا۔ مخالف سمت والی برتھ پر ایک بڑی بی اپنے خاندان کے ساتھ بیٹھی تھیں اور دوسروں سے زیادہ وہ اپنے پاندان سے دلچسپی لیتی نظر آ رہی تھیں۔ پان کے مقدس انہماک نے انہیں میری طرف دیکھنے کی مہلت نہ دی۔ چلو اچھا ہی ہے۔ میں نے سوچا خدا کرے یہ تمام سفر اسی طرح محو رہیں۔ گاڑی چھوٹنے میں صرف تین منٹ باقی تھے۔ میں نے کھڑکی سے باہر اسٹیشن کی گہما گہمی کا جائزہ لیا۔ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر جس کے مقدر میں صرف دوبار گاڑیوں کا گزرنا لکھا ہوا تھا۔ اس وقت شاید اپنی رونق کے شباب پر تھا۔ پھیری اور خوانچے والے اس مختصر سے وقفے میں اپنی چیزیں جلد از جلد بیچ لینا چاہتے تھے۔ ان کے شور وغل سے اسٹیشن کی مختصر سی عمارت گونج رہی تھی۔ ان کے علاوہ کچھ پہاڑی لوگ تھے جو

سروں پر گٹھریاں رکھے اپنی عورتوں کو اپنی حفاظت میں لیے تھرڈ اور انٹر کے درجوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اسٹیشن کی چہار دیواری سے باہر حد نظر تک سبزی مائل سیاہ جھاڑیاں اور جنگل، اونچے نیچے ٹیلے اور ساکھو اور ڈھاک کے لمبے اور سیدھے درخت نظر آ رہے تھے جن کے نیچے سرخ مٹی میں سفید پتھر اور درختوں کے ٹھنڈے سائے میں سبز گھاس کے درمیان عجیب سا امتزاجی تاثر پیش کر رہے تھے۔ دور پہاڑیوں پر کہیں کہیں سفید سفید عمارتیں دور سے کھلونوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ پہاڑی کی ڈھلوانوں سے گزرتا ہوا راستہ اور اس کے دونوں طرف پتھروں کا سلسلہ بے حد رومانی تھا۔ سینی ٹوریم اور پاگل خانے کے لیے شہرت رکھنے والا یہ مقام کتنا پُر کشش ہے۔ اس کے حسن کو بھلا ان دکھوں سے کیا تعلق!

میری سوچوں کا یہ سلسلہ ایک نئے مسافر کی آمد سے بکھر گیا۔ آنے والا ایک لڑکا تھا۔ دبلا پتلا، سترہ اٹھارہ سال کا نوعمر، جس نے کچھ سامان قلی کی مدد سے میرے اوپر والی برتھ پر رکھوایا۔ اس کے پیچھے ایک عورت داخل ہوئی جس کے ساتھ ہی کمپارٹمنٹ میں رنگ اور بو کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ وہ میرے قریب کھڑی تھی۔ تیئیس یا چوبیس سال کی ایک جوان عورت، نارنجی رنگ کی ساڑی میں ملبوس، آنچل شانوں پر پڑا تھا۔ اس کی خوبصورت پشت صندل جیسی چکنی اور سڈول تھی۔ کھلے بازوؤں والے بلاؤز میں اس کے بازو بے حد متناسب معلوم ہو رہے تھے۔ بے شکن بلاؤز اس کی صحت مندی کی گواہی دے رہا تھا۔

اچانک وہ میری طرف گھومی تو میں نے بڑے شوق سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بڑی مکمل عورت ہے۔ میں نے سوچا اور اپنی برتھ پر سرک کر بیٹھ گئی۔ وہ اداس اور قنوطی سا لڑکا سامان رکھوا چکا تھا۔ سامان مختصر ہی سا تھا۔ میں نے بڑی دلچسپی سے ذرا قریب سے اس کا جائزہ لینا شروع کیا (دراصل خوبصورت اور سجی ہوئی عورتیں مجھے یوں بھی بڑی اچھی لگتی ہیں) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی سنگھار کیا ہے۔ چہرے پر ہلکے پاؤڈر کی تہہ میں مخمل کے روئیں کی سی نرمی اور نزاکت کا عکس تھا۔ لپ اسٹک بھی کپڑوں سے میچ کرتی ہوئی بڑی اچھی

لگ رہی تھی بلکہ اس لپ اسٹک نے اس کے ہونٹوں کو ترشے ہوئے یاقوت کی طرح جگمگا دیا تھا۔ کانوں میں لمبے لمبے جڑاؤ آویزے تھے۔ ناک میں ہیرے کی جگمگاتی ہوئی کیل، کلائیاں کانچ کی نازک نارنجی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ چوڑیاں گرچہ بہت زیادہ تھیں مگر اس کی بھری بھری سڈول کلائیوں میں بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ ہر چیز جو اس کے جسم پر ہے ایسی ہے جو صرف اسی کے جسم پر اچھی لگ سکتی ہے۔ پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ اس کا سارا حسن اس کی غیر معمولی بشاشت اور بے ساختہ اداؤں میں مضمر ہے۔ وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ اتنی مسرت ایک ساتھ یہ کہاں سے سمیٹ لائی۔

مجھے اپنی طرف یوں گھورتے دیکھ کر وہ ذرا شرمائی اور اس کی پلکیں خود بخود جھک گئیں۔ گھنی پلکوں کے سائے میں حد سے زیادہ سیاہ اور چمکیلی آنکھوں سے رہ رہ کر جب بھی وہ پلکیں اٹھاتی، ایک ہلکی سی شعاع جیسے ان میں سے پھوٹتی اور سارے چہرے کو منور کر دیتی۔ کم از کم مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ ان آنکھوں کی بے پناہ چمک اس کے دل میں چھپے ہوئے مسرتوں کے خزانے کی غماز تھی۔ بہرحال کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی ان آنکھوں میں جس نے بے حد متاثر کیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں اتنی دیر سے اس طرح اس کا جائزہ لے رہی ہوں۔ نہ جانے اسے اس کا احساس بھی ہے یا نہیں، پتہ نہیں وہ کیا سوچے۔

''کہاں جائیں گی آپ؟'' یوں ہی ایک سوال میں نے کر دیا۔

''دولت آباد!'' اپنی انگلی میں سرخ مینا کاری کی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے اس نے کہا۔ ''مجھے بھی تو دولت آباد ہی جانا ہے'' میں نے کہا ''چلیے وقت اچھا گزرے گا۔'' ''اچھا آپ بھی وہیں جا رہی ہیں!'' اس نے چہک کر کہا۔ اندرونی مسرت جیسے دبائے نہ دبے۔ ''دولت آباد میں کہاں جا رہی ہیں آپ؟'' میں نے باتوں کے سلسلے کو ذرا بڑھانے کی خاطر پوچھا۔ ''اپنے گھر!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اس ایک جملے میں آسودگی اور اطمینان کی ایک دنیا آباد تھی۔

''اللہ! تو نے اسے خوشیوں کا خزانہ ہی بخش دیا ہے۔ اس کی تو ہر ادا سے مسرت پھوٹی پڑ رہی ہے۔'' میں نے بڑے رشک سے سوچا اور ضبط کے باوجود میرے منہ سے ٹھنڈی سانس نکل ہی پڑی۔

اس کی شخصیت مجھے بڑی دلکش نظر آئی۔ وہ مجسم مسرت تھی۔ اس زمانے میں جبکہ خوشیوں کا قحط عام ہے، آسودگی، طمانیت اور مسرت سے مالا مال یہ شخصیت میری توجہ کا مرکز کیوں نہ بنتی۔ چنانچہ میں سراپا توجہ بن کر اس سے باتیں کرنے کو اس سے اور بھی قریب آ گئی۔ بھینی بھینی دلکش خوشبو نے بڑھ کر میرا خیر مقدم کیا۔ اس کا وجود خود ایک خوشبو سے بھری ہوئی شیشی جیسا تھا جو اپنی مسرتوں کی خوشبو بڑی فیاضی سے لٹا رہی تھی۔ خوشبو بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ خالص ہو تو اپنا نقصان کیے بغیر ماحول کو دلکش اور شخصیت کو دلآویز بنا دیتی ہے۔

گفتگو کا سلسلہ تو ختم ہو چکا تھا۔ اب پھر بات شروع کرنے کے لیے کوئی موضوع نہیں مل رہا تھا۔ وہ مختصر سا جواب دے کر اپنے وینٹی بیگ میں گم ہو گئی تھی۔ اس نے ایک دستی آئینہ نکال لیا تھا اور بڑے انہماک سے اس میں دیکھ دیکھ کر اپنے بالوں کی بکھری ہوئی لٹوں کو درست کر رہی تھی۔ میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے اس کے سینٹ کی تعریف کر دی۔

''بڑی پیاری خوشبو ہے، آپ کون سا سینٹ استعمال کرتی ہیں؟''

اس نے آئینہ بڑے اطمینان سے اپنی وینٹی بیگ میں رکھ دیا۔ کہنے لگی۔

''پتہ نہیں۔ میں نے آج تک اس کا نام بھی نہیں دیکھا۔ بس وہ ہمیشہ یہی لاتے ہیں۔ شادی کے بعد سے میں نے آج تک ہمیشہ یہی سینٹ استعمال کیا ہے۔''

''اللہ رے خود فراموشی'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ پھر بات بڑھانے کو کہہ دیا۔

''بڑے باذوق معلوم ہوتے ہیں آپ کے شوہر!''

یہ سن کر ایک دم اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھوں میں دیوالی کے چراغ

جگمگا اٹھے۔ گھنی سیاہ پلکوں نے شعاعیں خارج کرنے والی آنکھوں پر گویا پردہ سا ڈال دیا۔ تھوڑی دیر وہ کھوئی سی از خود رفتہ سی بیٹھی رہی پھر بولی۔

''پتہ نہیں۔ ذوق کے بارے میں نہیں جانتی۔ مجھے تو ان کی لائی ہوئی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔'' وہ کسی دھیان میں بڑی نرمی سے جس میں حجاب کی بھی پرچھائیاں تھیں مسکرا رہی تھی۔

''دراصل آپ کو ان کی شخصیت سے بہت پیار ہے۔ وہ بھی تو بہت چاہتے ہوں گے آپ کو؟''

یہ سوال خود بخود میری زبان سے پھسل پڑا۔ شاید یہ سوال عورت کی فطرت ثانیہ ہے جو کبھی تو ہونٹوں سے باہر آ جاتا ہے اور کبھی بازگشت بن کر دل ہی میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔

میرے اس سوال پر پھر بہت سے چراغوں کی لوئیں اس کے چہرے کے گرد گردش کرنے لگیں۔ اس کے خوبصورت چہرے سے روشنی سی پھوٹنے لگی۔ اس بار اس کے چہرے پر مسرت کے ساتھ ساتھ فخر کا احساس بھی جگمگا رہا تھا۔

اس کی خاموشی پر میں نے اپنے سوال کا بے تکا پن محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجیے گا شاید میرا یہ سوال آپ کو برا لگا ہو۔''

''نہیں نہیں ...... نہیں تو ...... برا کیوں لگے گا۔'' وہ اپنے خیالوں سے چونک کر جلدی سے بولی۔

''اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے۔ میں تو یوں ہی چپ ہو گئی تھی۔ شوہر بیویوں کو چاہتے ہیں اور میرے شوہر تو بچپن سے مجھ سے وابستہ رہے ہیں۔ ہماری محبت تو ہوش سنبھالتے ہی پنپنے لگی تھی۔''

''بڑی خوش قسمت ہیں آپ'' میں نے کہا۔ ہر شوہر تو اپنی بیوی سے اتنی محبت نہیں کرتا'' میری اس بات پر وہ کھل اٹھی اور شاید مارے خوشی کے مجھ سے ایک بے تکا سا سوال کر

بیٹھی۔

''کیا آپ کے شوہر نہیں چاہتے آپ کو؟ وہ بھی تو چاہتے ہوں گے؟'' اس سوال پر مارے شرم کے میرے کانوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں پھر فوراً ہی دکھ اور محرومی کے شدید احساس نے شرم کے فطری احساس کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ میری نظروں میں بے ساختہ اسد کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ اسد جو مجھے اپنی شریک حیات بنانا تو چاہتا ہے لیکن میری ذمہ داریوں کو اپنی زندگی میں شریک کرنے کو تیار نہیں۔ میرے اپنے مسائل کی سنگین اور ناقابلِ تسخیر دیوار گزشتہ پانچ سال سے میرے اور اس کے درمیان کھڑی ہے اور اب ہوسکتا ہے اسد کوئی اور منزل تلاش کر لے۔ انتظار کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔

اچانک اس کی آواز سے میری سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ سراپا شگفتگی بنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر شرارت کا تبسم تھا۔

''آپ تو جیسے اپنے اُن کے تصور میں کھو گئیں!''

''ارے نہیں تو!'' میں نے جلدی سے گھبرا کر جواب دیا۔ میری اس گھبراہٹ پر تو وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ موتی جیسے دانت اس کے چمکیلے ہونٹوں پر اپنا عکس چھوڑ گئے۔ اس طرح ہنستی ہوئی وہ مجھے اور بھی اچھی لگی۔

''واقعی تم چاہے جانے کے لائق ہو'' میں نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر باتوں کا رُخ بدل دیا۔

''دولت آباد آپ کا میکہ ہے یا سسرال؟''

''دونوں'' اس نے جواب دیا ''میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے سے ہوئی۔ ابھی یہ چھوٹے ہی تھے کہ پھوپھی اور پھوپھا دونوں ختم ہوگئے۔ چنانچہ امی ابا نے ان کی پرورش کی اور پھر جب میری پیدائش ہوئی تو امی نے ان سے منگنی کر دی۔ ٹھیکرے کی منگنی کا دستور ہمارے یہاں عام ہے۔ پھوپھی نے اپنی زندگی ہی میں مجھے مانگ لیا تھا۔ چنانچہ اسی خیال

سے امی نے منگنی بھی کر دی۔ شاید انہیں ہم سے جدا ہونا تھا اس لیے وقت سے پہلے انہوں نے یہ فرض انجام دے دیا۔

''تو آپ کی امی بھی بچپن ہی میں انتقال کر گئی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' مختصر سا جواب دیتے ہوئے وہ بھی اداس ہو گئی۔

''شکر ہے آپ کے والد زندہ ہیں۔ خدا انہیں سلامت رکھے'' میں نے تلخ ذکر کو ختم کرنا چاہا۔ میرے اس جملے پر اس کے چہرے پر سیاہی سی دوڑ گئی۔ کہنے لگی۔

''یہ سہارا بھی میری قسمت میں نہ رہا۔'' اس کی آواز دکھ سے لرز رہی تھی ''والد نے بڑے ارمان سے میری شادی کی اور ڈیڑھ سال بعد ہی جب میں ماں بننے کے خوش آئند تصور سے سرشار تھی کہ اچانک بیمار پڑی اور اسی بیماری میں مجھے اس بچے کی موت کا صدمہ بھی اٹھانا پڑا جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ جسمانی اور روحانی اذیتوں نے مجھے بے حد نڈھال کر دیا تھا۔ ایک دن صبح جب میں اسپتال ہی میں اس خوشی کا ماتم کر رہی تھی جو میری طرف دونوں ہاتھ پھیلائے ہمک رہی تھی، لیکن میری گود میں آتے آتے آسمان کی طرف پرواز کر گئی، میری آنکھیں اور دل ابھی اسی صدمے سے اشکبار تھے کہ معلوم ہوا کہ میرے ابا جان پر فالج کا دورہ پڑا ہے اور وہ بیہوش ہیں۔ جسم میں اٹھنے کی سکت نہ تھی۔ میں اپنی کھوئی ہوئی طاقت کا انتظار کرتی رہی لیکن ابا جان نے میرا انتظار نہ کیا......''

باتیں کرتے کرتے اس کی آنکھوں کے سارے چراغ جیسے بجھ گئے۔ چہرے پر زردی چھا گئی اور ان خوبصورت آنکھوں میں عجیب قسم کی وحشیانہ چمک پیدا ہو گئی وہ چہرہ کچھ عجیب سا بن گیا۔ مجھے بے ساختہ چچا میاں یاد آ گئے۔ بڑی دیر بعد۔ اس وقت اس حسین چہرے پر ویسی ہی وحشیانہ چمک تھی جو چچا جان پر باتیں کرتے کرتے دورہ پڑ جانے پر نظر آتی تھی۔ اس مماثلت کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ مجھے اس خیال کا بے تکا پن محسوس کر کے بڑی خفت سی محسوس ہوئی۔ بھلا کہاں چچا میاں کا خوفناک چہرہ اور کہاں حسن کی آب و تاب سے جگمگاتا

ہوا یہ بشاش چہرہ۔ دونوں میں کتنا فرق ہے۔

''بے چاری پر اب تک ان واقعات کا گہرا اثر ہے'' میں نے بڑے دکھ سے سوچا۔

''واقعی دنیا میں خوشی بڑی گراں ہوتی ہے۔''

ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ خود بخود پھر سے باتیں کرنے لگی۔ شاید انسان دوسروں کے سامنے اپنے دکھ کا اظہار کر کے طمانیت حاصل کرتا ہے۔ کبھی کبھی تلخ یادوں کو کریدنا بھی دل کے زخموں پر پھایا رکھنے کے مترادف ہے۔ شاید وہ بھی سب کچھ کہہ کر اپنا دل ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

''امی کے بعد ابا جان نے کبھی مجھے محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

''سارے لاڈ پیار اور ضدیں پوری کرتے رہے۔ بچپن میں تو خیر ہتھیلی کا پھپھولا بنی رہی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری شادی سے کچھ دنوں پہلے تک اکثر راتوں کو نیند ٹوٹتی تو دیکھتی ابا میرے کمبل کو میرے جسم پر برابر کر رہے ہیں یا مسہری کا پردہ ٹھیک کر رہے ہیں۔ جب میں انہیں منع کرتی تو کہتے ''بیٹی! اس کے بغیر مجھے نیند ہی کب آتی۔ یہ تو میرا روزانہ کا معمول ہے'' بولتے بولتے وہ اچانک اداس سی ہوگئی۔ اس کے روشن چہرے پر تاریک سائے لہرانے لگے۔

''زندگی ان دنوں کتنی سبک رواں اور مترنم تھی۔ جیسے پہاڑی کے دامن میں بہتے ہوئے نرم رو جھرنے، صاف شفاف اور رواں دواں'' وہ پھر کہنے لگی ''میں، ابا جان اور فاروق، زندگی ایک مثلث کے تین زاویوں میں سمٹ آئی تھی۔ کس ارمان سے انہوں نے میری شادی کی۔ ہر وقت بچوں کی طرح مسرور رہا کرتے۔''

وہ کھڑکی سے باہر اونچے اونچے پہاڑوں، شاداب وادیوں اور جا بجا پہاڑیوں کی دراڑوں میں سے ابلتے ہوئے شفاف پانی کے چشموں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہماری خوشیوں کے تمام خواب مشترک ہوا کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ تمناؤں کا وہ پھول جو پھول بننے اور اپنی خوشبو سے ہمارے دل و دماغ کو معطر کرنے سے پہلے ہی شاخ سے گر گیا اس کی آرزو میں بھی ابا ہمارے شریک تھے۔ کھلونوں اور ننھی ننھی چیزوں سے انہوں نے کمرہ بھر دیا تھا۔ چھوٹی سی ایک مسہری بھی بنوالی تھی انہوں نے ...... مگر یہ سب کچھ ایک خواب تھا جو بیدار ہونے پر ختم ہو گیا ...... بہر حال وہ بے چارہ بھی کم انمول نہیں۔ میرا شریک زندگی فاروق اس صدمے میں میں اسے بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔ کتنی ظالم ہوں میں۔ یہ شاید وہی زمانہ تھا جب دشمن نے ہمارے ملک پر حملہ کیا تھا'' وہ ذہن پر زور ڈال کر سوچتے سوچتے بولی'' اور فاروق کو جنگ میں اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے جانا پڑا، وہ ایئر فورس میں تھا نا'' وہ بولے جا رہی تھی مگر یوں جیسے خواب میں بول رہی ہو۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑی جذباتی معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس مرغزار کے نیچے یہ آتش فشاں بھی تھا۔ میں نے حیرت سے سوچا۔

اچانک وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی کہنے لگی'' نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی سلامتی کے لیے کبھی دعا بھی نہیں مانگی، وہ کتنی محبت سے مجھ سے رخصت ہوا تھا۔ نہ جانے بے چارے پر کیا گزری ہو۔ میری بیماری نے یوں ہی اسے دیوانہ سا کر دیا۔ اس کے اندرونی اضطراب کا اندازہ اس کی بے چین آنکھوں اور حرکات سے ہو رہا تھا۔ وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ میں اس کی اس کیفیت سے بہت متاثر ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اسے تسلی دوں۔ آخر کار میں نے کہا۔

''خیر کوئی بات نہیں۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ آپ کا سب سے قیمتی اثاثہ آپ کے شوہر ہیں۔ وہ آپ کے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ خدا ان کی زندگی اور ان کا پیار قائم رکھے۔ آپ کے پاس خوشیوں اور مسرتوں کی کمی نہ ہو گی۔ بچے تو پھر بھی ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔ رہے والدین تو وہ بھی دیر یا سویر ساتھ چھوڑ ہی دیتے ہیں۔''

شوہر کا نام سن کر وہ خاموش ہوگئی جیسے اسے سکون سا مل گیا۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ دراصل اس مجسم مسرت کو اندوہ گیں دیکھ کر مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی خاموش نظریں جھکائے اپنی انگلیوں سے نیل پالش کھرچ رہی تھی۔ اس کے گالوں پر لرزتے ہوئے پلکوں کے سائے میں بیتے ہوئے دنوں کا عکس نظر آ رہا تھا۔ ایکسپریس ٹرین چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی تیزی سے بھاگتی جا رہی تھی۔ باہر ٹیلیفون کے تار، کھمبے، اونچے نیچے درخت سب جیسے بھاگے جا رہے تھے۔ پھر گاڑی غالباً کسی جنکشن پر رکی۔ کچھ پرانے مسافر اترے اور نئے سوار ہوئے۔ بڑی بی جو سارے راستے پان کھاتی رہی تھیں یا سوتی رہی تھیں مع اپنے پاندان کے اتر گئیں۔ ان کی جگہ ایک دوسری عورت اپنے بچوں کے ساتھ اسی برتھ پر آ بیٹھی۔ بچوں نے مونگ پھلی اور کیلے بے تحاشا خریدنا شروع کر دیے۔

ہم لوگ اسٹیشن کی چہل پہل دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔ وہ عورت بھی کھڑکی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اسی وقت وہ اداس اداس سا لڑکا بھی آ گیا۔ کچھ دیر عجیب نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر مجھ سے کہنے لگا کہ ''ذرا ان کا خیال رکھیے گا یہ بیمار ہیں۔'' میں نے حیرت سے پہلے لڑکے کو اور پھر عورت کو دیکھا۔ لفظ بیمار خود لڑکے کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ عورت کے چہرے پر تازہ چھلی ہوئی نارنگی کی سی تازگی اور شگفتگی تھی۔ مگر لڑکے کا چہرہ جذبات سے جیسے عاری تھا۔ میں ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ ڈبے سے اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا تھرماس تھا۔ اس نے چائے کے لیے پوچھا میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اب تو منزل قریب ہی ہے۔ مگر وہ چائے کا آرڈر دے آیا تھا۔

''آپ کا یہ دیور آپ کو بہت چاہتا ہے'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''کہہ رہا تھا آپ بیمار ہیں۔''

''کہیں بھی بیمار نہیں'' وہ حیرت سے بولی ''اب تو میں بالکل اچھی ہوں۔ یہ تو اسپتال والوں کی زبردستی ہے جو مجھے اتنے دنوں بیمار بنائے رکھا۔''

''اکلوتا دیور جو ٹھہرا۔'' وہ میری بات پر ہنس کر بولی ''ان کا بڑا لاڈلا بھائی ہے یہ'' وہ اسے بڑے پیار سے دیکھنے لگی۔ ''دراصل اس وقت ان کو اپنے بھائی کی قائم مقامی کا اعزاز بھی تو ملا ہوا ہے۔ کچھ زیادہ ہی فرض شناس بنے ہوئے ہیں۔''

ہم دونوں نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ بس ذرا سا مسکرا کر رہ گیا۔ شاید اسے یہ ذکر اچھا نہ لگا اور پھر وہ اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ اس نے بڑے پیار سے لڑکے کو جاتے ہوئے دیکھا۔ کہنے لگی ''اب تو کافی بدل گیا ہے ورنہ پہلے بڑا کھلنڈرا اور لاپرواسا تھا۔ یہ عمر ہے بھی تبدیلیوں کی۔''

مجھے تو یہ لڑکا ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ خاک کھلنڈرا ہوگا۔ صورت پر تو محرم برس رہا تھا۔ میں نے جل کر سوچا۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے اسے اپنے بھائی سے بھی محبت نہیں۔ بھائی کا ذکر ہی سن کر چل دیا۔ یہ عورت بڑی نیک دل معلوم ہوتی تھی جو یہ سمجھتی تھی کہ اسے بھائی سے بڑی محبت ہے۔ بعض چھوٹے بھائیوں کو تو شروع ہی سے بڑے بھائیوں کے گھر میں غیر معمولی اقتدار سے حسد ہو جاتا ہے اور جوانی تک پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ممکن ہے یہ ایسا ہی بھائی ہو۔ پھر مجھے اس کا ''ذرا ان کا خیال رکھیے گا'' یاد آیا تو میں نے سوچا کہ ممکن ہے یہ محض بھابی سے ''غیر معمولی'' دلچسپی کا نتیجہ ہو۔ وہ تھی بڑی پُرکشش۔

بیرا چائے لے کر آ گیا اور میرے خیالات کا تار ٹوٹ گیا۔ اس نے بڑے اصرار کے ساتھ مجھے بھی چائے اور بسکٹ میں شریک کیا۔ اس کے چہرے پر وہی شادابی پھر لوٹ آئی تھی اور ایک بچے کی طرح خوشی سے چہک رہی تھی۔ چائے پیتے پیتے گاڑی چل پڑی۔ باتوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ دو اجنبیوں کے درمیان مسلسل باتیں کرتے رہنے کا امکان ہی کہاں تھا۔ ابھی دو گھنٹے اور گزارنے تھے۔ چار بج چکے تھے اور چھ بج کر بیس منٹ پر کہیں گاڑی کو دولت آباد پہنچنا تھا۔ میں نے سوٹ کیس کھول کر اپنی وہ کتاب نکالی جو میں پچھلے ایک ہفتے سے پڑھ رہی تھی۔ ذہنی الجھنوں کے باعث اتنی دلچسپ کتاب بھی ختم نہ ہو پائی تھی۔ آدھی کتاب

میں اوراق کے درمیان جہاں میں نے نشان لگا کر چھوڑ دیا تھا وہیں سے پھر شروع کیا۔

میں کتاب کی دلچسپیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔اسی وقت میرے پیروں کے پاس گلابی ربن سے بندھا ہوا لفافوں کا ایک پیکٹ کہیں سے گرا۔اس میں سے خوشبو آ رہی تھی۔اسی سینٹ کی خوشبو جس سے اس کا اپنا وجود بسا ہوا تھا۔وہ سوٹ کیس کھولے کچھ نکال رہی تھی۔ جب ہی پیکٹ گرا۔میں نے پیکٹ اسے تھما دیا۔لیکن اب میرا دل کتاب میں نہیں لگ رہا تھا۔ میں چوری چوری اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔اس نے پیکٹ کھول دیا تھا۔تمام لفافوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوئے تھے۔اس نے بڑے انہماک سے انہیں کھول کھول کر ترتیب دیا اور پھر پڑھنے لگی۔بعض خطوط وہ دو دو بار پڑھتی۔اس کے چہرے پر خوشیوں کی گلابی چھلک رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا چہرہ کان کی لوؤں تک تمتما جاتا۔میں بظاہر کتاب کھولے ہوئے تھی لیکن میری نگاہیں اس کے اس دلچسپ مشغلے کا جائزہ لے رہی تھیں۔چند خطوط پڑھنے کے بعد اس نے بڑی احتیاط سے انہیں انہیں لفافوں مس بند کیا جن میں نمبر لگے تھے۔میں بڑی رشک آمیز دلچسپی سے اس کے اس دلچسپ شغل کو دیکھ رہی تھی۔خطوط کا پیکٹ بند کرنے کے بعد اس نے ایک لمبا لفافہ نکالا۔اس میں سے بڑے سائز کی ایک تصویر نکالی اور اس میں کھوگئی۔

وہ کسی خوبصورت اور وجیہہ جوان کی تصویر تھی۔ایر فورس کی وردی میں ملبوس۔میں نے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا۔میری چوری اس سے چھپ نہ سکی۔اس نے مجھے چپکے چپکے دیکھتے دیکھ لیا۔

''یہ آپ کے شوہر کی تصویر ہے شاید؟''میں نے برجستہ سوال کر دیا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس کی محبت پاش نظریں تصویر پر جھک گئیں۔کچھ نہ کہہ کر بھی اس نے ایک ادائے دلبری سے میرے سوال کا جواب دے دیا تھا۔اس کا چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا تھا۔وہ شرما رہی تھی۔سمٹی جا رہی تھی نئی دلہنوں کی طرح۔اس کی نگاہیں جیسے تصویر سے گزر کر تصور تک جا پہنچی تھیں اور ماضی کے رنگین لمحوں کے سرور سے مدہوش ہوئی جا رہی

تھی۔ سرشاری کے اس عالم میں وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے تصویر کی تعریف کی اور ساتھ ہی اسے چھیڑا ''بس اب یہ بے قراری ختم ہی سمجھیے۔ صرف دو گھنٹے بعد ہی تو وہ مل جائیں گے۔ آپ کو لینے اسٹیشن تو آئیں گے نا؟''

''ضرور آئیں گے'' اس نے جھینپ کر تصویر لفافے میں رکھ دی اور سوٹ کیس بند کرتے ہوئے بولی ''وہ تو بے چین ہوں گے مجھ سے ملنے کے لیے۔ خدا کرے اچھے ہوں۔ جنگ کی سختیاں سہہ کر آئے ہیں۔''

''تو جب سے آپ ان سے ملی ہی نہیں؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''جنگ ختم ہونے سے پہلے کیسے مل سکتی تھی۔ میں لاکھ چاہتی سہی لیکن وطن کی آبرو کی حفاظت مجھ سے زیادہ ان پر فرض تھی۔ وہ ہمیشہ ہی یہی کہتے تھے۔''

''بہر حال جنگ ختم ہوئے بھی کئی سال گزر گئے۔''

''ہاں ایسا لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئیں۔'' اس نے خوابناک سے لہجے میں کہا۔

میں نے اس کے اس شاعرانہ انداز کو دل ہی دل میں سراہا۔ واقعی محبوب کے بغیر گزارا ہوا زندگی کا ہر لمحہ سینکڑوں برس کا ہوتا ہے۔

''کوئی بات نہیں'' میں نے کہا ''ہجر کی یہ گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں۔ آپ کی بے قراری بھی ختم ہو جائے گی اور ان کو بھی سکون مل جائے گا۔''

اس نے گھڑی دیکھی اور اپنا سامان ترتیب دینے لگی۔

''ابھی تو کوئی ڈیڑھ گھنٹے باقی ہیں۔ کچھ دیر آرام سے بیٹھیے۔'' میں نے کہا اور وہ اپنی جلد بازی پر کچھ محجوب سی ہو کر بیٹھ گئی۔

''دولت آباد میں آپ کہاں رہتی ہیں؟'' یہ پہلا سوال تھا جو اس نے براہ راست مجھ سے کیا۔

''سبزی منڈی میں'' میں نے جواب دیا ''اور آپ؟''

''سول لائن'' وہ بولی ''ہمارے بنگلے کا نمبر 23 ہے۔ آیئے گا کسی روز۔ فاروق سے مل کر آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ بہت دوست نواز اور Jolly ہیں۔''

ذرا دیر بعد کہنے لگی۔ میں آپ کو وہ پودا دکھاؤں گی جو شادی کے بعد میں نے فاروق کے ساتھ مل کر لگایا تھا۔ لان کے بیچوں بیچ تا کہ اس کے سائے میں ہم شام گزار سکیں۔ بڑے ہونے پر جب اس میں گل مہر کے سنہرے اور چمپئی پھول لگیں گے تو ہم وہاں شام کی چائے پئیں گے'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ پھر کہنے لگی۔ ''گیٹ پر جیسمین کی بیل ایک طرف میں نے اور دوسری طرف فاروق نے لگائی تا کہ دونوں بڑھ کر آپس میں مل جائیں۔

اس نے کہا تھا کہ ''اس طرح ہماری محبت کی علامت گھر کے باہر ہی سے دیکھی جا سکے گی۔''

وہ کہتے کہتے رک کر خاموشی سے خلا میں گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں مسرت اور حیرت کی چمک تھی۔ جیسے وہ یہ سوچ رہی ہو کہ جیسمین کے دو الگ الگ پودے جن کی جڑیں الگ ہوں کس طرح بڑھ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ یوں کہ انہیں علیحدہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

''جانے وہ سب اب کس حال میں ہے'' وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔ ''خیر ہم دونوں مل کر اسے پھر ٹھیک کریں گے۔ پھر سے سب کچھ سجائیں گے'' اس کی آنکھوں میں نئی دلہنوں کی طرح سنہرے خواب نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے گھر کا ذکر کرتے ہوئے فرط مسرت سے میرا ہاتھ بے ساختہ پکڑ لیا۔ ان ہاتھوں میں محبت کی کیسی حرارت تھی۔

''ہم پھر سے پچھلے تمام دکھوں کو بھول کر نئی زندگی شروع کریں گے'' وہ کہہ رہی تھی ''آپ ہماری خوشیوں میں شریک ہونے آیئے گا نا؟''

''ضرور آؤں گی۔'' میں نے اس کی بچوں کی سی مسرت سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کا گل مہر اور جیسمین ضرور دیکھوں گی۔''

''گل مہر آپ کو بھی پسند ہے نا۔ مجھے تو ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے۔'' وہ چہک رہی تھی۔ اتنی دیر میں کافی بے تکلف ہو چکی تھی۔ کہنے لگی ''مارچ اپریل کی خوبصورت شامیں ہم انہیں درختوں کے نیچے ٹہلتے ہوئے گزارتے تھے۔ زمین ان کی پنکھڑیوں سے سونے کی طرح چمکتی۔ جب ہم گھر آتے تو ہمارے بالوں میں اس کی سنہری پنکھڑیاں اٹکی ہوئی ہوتیں۔ ہم ایک دوسرے کے سرے انہیں چن چن کر نکالتے۔ یہ یکجائی سانسوں کی یہ قربت کہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن بھی سن سکیں۔ کتنی مسرور کن تھی'' وہ حد درجہ جذباتی ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں جیسے خواب سے اتر رہے تھے۔

''مجھے تو وہ چند لمحے سب سے قیمتی معلوم ہوتے تھے'' ایک خود فراموشی کے عالم میں اس نے کہا۔

اتنی دیر میں مجھے اس اجنبی عورت سے کتنی قربت ہو گئی تھی۔ کچھ عجیب سی وابستگی کا احساس تھا کہ میں اس کے خوبصورت شوہر، خوبصورت گھر اور خوشگوار زندگی کے تصور میں اپنے تمام مسائل بھلا بیٹھی۔ یہ عورت ایک خوشگوار حقیقت کی طرح میرے حواس پر طاری ہو گئی تھی۔ ہم دونوں ہی اپنے اپنے خیالات میں کھو گئے۔ گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ ہم دونوں ہی شام کے ملگجے اندھیرے میں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔

گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ ہماری منزل آ پہنچی تھی۔ میں اپنے خیالات سے چونک کر اپنا سامان درست کرنے لگی۔ سامان ہی کیا تھا۔ کھلی ہوئی کتاب سوٹ کیس میں رکھی اور بند کر دیا۔ اس نے بھی اپنے خطوط اور تصویروں کے پیکٹ سوٹ کیس میں بند کیے اور تولیہ لے کر جلدی سے باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ گاڑی ریلوے یارڈ کے قریب آ پہنچی تھی اور جب تیزی سے پٹریاں بدل بدل کر اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہی ہونے والی تھی کہ وہ باتھ روم سے برآمد ہوئی۔ وہاں شاید اس نے اپنی ساڑی کے فال ٹھیک کیے تھے کیونکہ اب وہ بڑی

اسمارٹ نظر آ رہی تھی اور جب ایک نظر میں نے اس کے چہرے کی طرف اٹھائی تو چہرے پر ہلکے ہلکے پاؤڈر کی تہہ بڑی خوش اسلوبی سے جمی نظر آئی۔ لپ اسٹک بھی لگائی تھی اس نے اور بال بھی درست کر لیے تھے، راستے کی تکان کا اثر زائل ہو چکا تھا اور وہ پھر ویسی تر و تازہ، شگفتہ اور شاداب تھی جیسی گاڑی میں آئی تھی۔ گاڑی اب طویل پلیٹ فارم پر رینگتے رینگتے رکنے کے لیے آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ میں نے ایک نظر اپنے سراپا پر ڈالی، پُرشکن ساڑی اور بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ ہی سے درست کیا۔ آخر اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ کون سا کوئی میرے استقبال کے لیے آ رہا تھا۔ اس نے اپنا سامان اٹھا کر برتھ پر رکھ لیا تھا اور بڑے اضطراب سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

گاڑی رک گئی تھی وہ اپنی متجسس نگاہوں سے پلیٹ فارم کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھایا اور اس سے رخصت ہو کر اور آنے کا وعدہ کر کے جلدی سے اتر گئی۔ مجھے گھر پہنچنے اور چچا میاں کے داخلے کی روداد امی اور بہنوں کو سنانی تھی۔ پلیٹ فارم کی ہلچل سے بے نیاز جلد سواری حاصل کرنے کی دھن میں تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ اجنبی عورت جو سارے راستے میرے حواس پر طاری رہی کچھ دیر کے لیے میرے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ رکشہ اسٹینڈ پر خلاف توقع کسی سواری کا پتہ نہ تھا۔ میں انتظار میں کھڑی تھی کہ وہی عورت اور وہ لڑکا آگے پیچھے آتے نظر آئے۔ تب میری نظروں نے ایک تیسرے چہرے کو بھی تلاش کیا۔ مگر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ لڑکا سامان رکھ کر ٹیکسی کی تلاش میں جانا چاہتا تھا اور وہ مصر تھی کہ ٹیکسی ویکسی کی ضرورت نہیں ''ذرا ٹھہر جاؤ وہ گاڑی لے کر آتے ہی ہوں گے۔'' لڑکا بھی ضدی تھا کہ ٹیکسی ہی پر جانے کے لیے مُصر تھا۔ وہ بار بار اسے قائل کر رہی تھی، بھئی آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ ذرا سا ٹھہر جاؤ گے تو کون سا نقصان ہو جائے گا۔ ممکن ہے کسی مصروفیت میں دیر ہو گئی ہو۔''

''بھابی وہ نہیں آئیں گے۔ دیر کرنے سے کیا فائدہ؟'' لڑکا اپنی ہی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''ایسا ممکن ہی نہیں کہ وہ نہ آئیں'' وہ بولی ''بس پانچ منٹ ٹھہر جاؤ۔''

لڑکے نے بڑی بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی وہ لپک کر میرے قریب آ گیا اور بڑی لجاجت سے بولا ''خدا کے لیے آپ ہی ذرا بھابی کو سمجھایئے نا۔''

''آخر آپ انہیں ٹیکسی پر جانے کے لیے کیوں مجبور کر رہے ہیں۔'' میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''وہ اپنے شوہر کے ساتھ جانا چاہتی ہیں تو تھوڑا انتظار کر ہی لیجیے۔ اگر آپ کے جانے کے بعد وہ یہاں آئیں گے تو خوامخواہ......''

''کون آئیں گے؟؟ میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا'' وہ جس شوہر کا انتظار کر رہی ہیں انہیں شہید ہوئے چوتھا برس ہے۔'' لڑکے کی آواز بھرا گئی۔ اتنی گمبھیر آواز جیسے میرے کانوں میں کسی نے لپکتے انگارے ڈال دیے ہوں۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حسرتوں کے سوا کچھ نہ تھا اور پھر مجھے ان ہزاروں سپنوں کا خیال آیا جو اس کی بھاوج آنکھوں میں سجائے شوہر سے ملنے جا رہی تھی۔

''اتنے بڑے المیے کی اُنہیں خبر تک نہ دی!'' میں نے آہستہ سے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو دماغی امراض کے اسپتال سے واپس آ رہی ہیں۔ ٹائیفائیڈ میں مبتلا تھیں یہ اس وقت جب ان کے والد کی موت کی خبر آ گئی اور بخار کی شدت میں باپ کی موت کی خبر نے انہیں سچ مچ پاگل کر دیا۔ ان ہی دنوں جنگ چھڑ گئی۔ چنانچہ میرے بھیا انہیں اسپتال میں داخل کر کے جنگ پر روانہ ہو گئے تھے۔ ان کی شہادت کی خبر جب آئی تو یہ روبصحت تھیں ڈاکٹر نے منع کیا کہ بالکل اچھی ہو جائیں تو یہ خبر انہیں آہستہ سنائی جائے ورنہ شدید ذہنی جھٹکا انہیں پھر پاگل کر دے گا۔'' لڑکا خاموش ہو کر پھر اس کی طرف چلا گیا۔ میرا ذہن بوجھل ہو رہا

تھا۔ایسا خلا نظر آ رہا تھا جیسے ہر طرف سناٹا ہو گیا ہو۔

خزاں کی اداس شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ پرندوں کے جوڑے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف پرواز کر رہے تھے اور وہ بدستور دور مغرب سے آنے والی سڑک پر نگاہیں گاڑے اپنے شوہر کی گاڑی کے نمودار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ میری طرف اس کے چہرے کا وہ حصہ تھا جس طرف اس کی ناک کی کیل پوری آب و تاب سے جگمگا رہی تھی۔ لیکن مغرب سے آنے والی سڑک کے اختتام پر کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

نام : حسانہ انیس

والد کا نام : پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

پیدائش : ہزاری باغ، جھارکھنڈ۔ (بھارت)

12/جولائی 1939ء

انتقال : 7/جولائی 2003ء (کراچی)

تعلیم : ادیب کامل (علی گڑھ یونیورسٹی)

ایم اے، اردو (ڈھاکا یونیورسٹی)

پیشہ : درس وتدریس (محکمہ تعلیم حکومت سندھ)

گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین، کراچی

گورنمنٹ کالج آف ہوم اکنامکس، کراچی

پرنسپل گورنمنٹ گرلز کالج اورنگی ٹاؤن، کراچی

ریٹائرمنٹ : 11/جولائی 1999ء بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر

آخری ملازمت بعد از ریٹائرمنٹ: پرنسپل Axis گرلز کالج، بہادر آباد، کراچی

ایوارڈز : بیسٹ ٹیچر آف دی ایئر۔ 1980

اعلیٰ تدریسی، ادبی اور انتظامی خدمات کے صلے میں سندھ پروفیسرز اینڈ لیکچررز ایسوسی ایشن کی جانب سے 1997ء میں اور کالج پرنسپلز ایسوسی ایشن کی جانب سے 1999ء میں شیلڈز عطا کی گئیں۔